آئینہ نما
{7}
مرتبہ
قرۃ العین

اینشا
{7}
مرتبہ
قرۃ العین

آئینہ نما

{7}

مرتب

قرۃ العین

نام کتاب	:	آئینہ نما(7)
مرتب/ناشر	:	قرۃ العین
پتہ	:	باغات برزلہ، نزدیک بون اینڈ جوئینٹ ہسپتال برزلہ سرینگر کشمیر فون:2433795، موبائل نمبر:9419015745
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	TFC سنٹر، مدینہ چوک، گاؤکدل سرینگر، فون :2473818
سال اشاعت	:	2008ء
قیمت	:	عام ایڈیشن =/200روپے لائبریری ایڈیشن =/300روپے
سرورق	:	اسلم نقشبندی

اپنی بات

''آئینہ نما'' کا ساتواں شمارہ پیش خدمت ہے۔ اس شمارے میں شمیم احمد شمیم کے دورۂ پاکستان کا سفرنامہ بہ عنوان ''پاکستان میں چالیس دن'' شائع کیا جارہا ہے۔ یہ 1969ء کی بات ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ''آئینہ'' اپنی اشاعت کے پانچ سال پورے کر چکا تھا۔ اس دوران شمیم صاحب اپنی سیاسی زندگی کا آغاز بھی کر چکے تھے۔ انہیں بطور ممبر اسمبلی تین سال ہو چکے تھے۔ آئینہ کی شہرت پاکستان تک پہونچ چکی تھی اور وہ مدیر ''آئینہ'' کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔

ان کے دورۂ پاکستان کا مقصد بنیادی طور پر 20 سال سے بچھڑے ہوئے رشتہ داروں اور دوستوں سے ملنا تھا لیکن یہ ایک صحافی اور سیاستدان کا دورہ بھی تھا۔ حسن اتفاق سے اس وقت پاکستان ایک پُر آشوب دور سے گذر رہا تھا۔ صدر ایوب خان کی آمریت کے خلاف مزاحمت کی تحریک کی ابتداء ہو چکی تھی اور شمیم صاحب کے وہاں ہوتے ہوئے یہ بغاوت اپنے نقطۂ عروج پر

پہونچ گئی تھی۔ اس طرح وہ اس سیاسی انقلاب اور اسکے منطقی انجام کے چشم دید گواہ تھے۔ اس لحاظ سے ان کا یہ دورہ تاریخی اور سیاسی لحاظ سے بہت اہم تھا۔

''پاکستان میں چالیس دن'' پاکستانی سیاست کے اتار چڑھاؤ، تاریخی حقائق، محرکات انقلاب، عوامی خواہشات، تاثرات اور ردِ عمل کی ایک جامع اور جاندار عکاسی ہے۔ پاکستانی سماج کا ایک بھرپور اور جیتا جاگتا آئینہ، جس میں مملکت پاکستان کے ہر شعبے کی جھلک ہے، اظہار بیان اتنا دلآویز اور حالات و واقعات کی تصویر کشی اس قدر دلچسپ اور جاندار کہ لگتا ہے تمام واقعات و مناظر بچشم خود دیکھ رہے ہیں۔

آج 40 سال کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی اس سفرنامے کی تاریخی اور سیاسی اہمیت کئی لحاظ سے مسلم اور مقدم ہے۔ سرحد کے اس پار کی سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد ان کا پہلا تاثر یہ تھا کہ ''انسان چاند پر پہنچ گیا ہے لیکن ایک کشمیری کے لیے سو میل کے فاصلے پر اپنے دوسرے کشمیری بھائیوں سے ملنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ میرے نزدیک یہی کشمیر کا مسئلہ ہے اور باقی جو کچھ ہے وہ اسی کی تفسیر اور تاویل ہے''۔ یہ ایک ایسی حقیقت کا اعتراف ہے جس سے کسی اختلاف کی گنجائش نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آج 60 سال کے بعد بھی یہ صورت حال برابر قائم ہے۔ آمد و رفت کو آسان بنانے کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود آج بھی دونوں طرف کے کشمیریوں کا ملنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔

پاکستان اور مظفر آباد میں مقیم کشمیریوں سے ملنے کے بعد، ان کے وطن واپس لوٹنے کی بے قراری اور تڑپ دیکھ کر، ان کے احساسات اور جذبات کو سمجھ کر شمیم صاحب نے ''ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے'' کے عنوان کے تحت ہندوستانی حکمرانوں سے مخاطب ہو کر لکھا ''جب تک پاکستان کی سرزمین پر ایک بھی ایسا کشمیری موجود ہے جو وطن واپس لوٹنے کی خواہش کے باوجود اپنے وطن سے دور ہے کشمیر کا مسئلہ برقرار رہے گا''۔

آج ہندو پاک کے درمیان مسئلہ کشمیر کو لے کر کانفرنسوں، سمیناروں اور باہمی بات چیت کا سلسلہ جاری ہے اور اختلافات کے باوجود اس بات پر دونوں فریقین متفق ہیں کہ مسئلے کے حل کی جانب پہلا قدم یہ ہے کہ آمد و رفت کو آسان بنا کر آر پار کے کشمیریوں کو ملنے ملانے کی سہولیت مہیا کی جائے۔ اس حقیقت کو اتنے زمانے قبل بعد تسلیم کرنا شمیم صاحب کی سیاسی بصیرت، تدبر، فہم و فراست اور حقیقت پسندی کا اعتراف ہے۔

مسئلہ کشمیر کے علاوہ اس سفر نامے میں پاکستان کے سیاسی و سماجی ڈھانچے، تعمیر و ترقی، صحافت، ثقافت، کا مفصل جائزہ بھی ہے جس سے کافی حد تک پاکستان کے متعلق بہت سی 'غلط فہمیوں' اور 'خوش فہمیوں' کے دور ہونے میں مدد ملتی ہے۔ 'پاکستان کی آمریت' اور 'ہندوستانی جمہوریت' کا موازنہ کافی دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔

آج پاکستانی سیاست نے ایک بار پھر کروٹ لی ہے اور صورتِ حال کم و بیش وہی ہے جو آج سے چالیس برس قبل تھی۔

یہ سفرنامہ اپنی ادبی اہمیت اور افادیت کے علاوہ کشمیر بلکہ برصغیر کی تاریخ اور سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک اہم تاریخی دستاویز کا کام دے سکتا ہے۔

سفرنامے کے بارے میں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

خیر اندیش

قرۃ العین

شمیم صاحب کی بیٹی سحر شمیم، مہمانِ خصوصی پریم شنکر جھا کو ''آئینہ نما''
کا چھٹا شمارہ پیش کرتے ہوئے

''آئینہ نما'' کی رسم رونمائی تقریب کی صدارت ڈاکٹر قمر ریئس نے کی۔ ان
کے ہمراہ تصویر میں وید بھسین، پریم شنکر جھا، قرۃ العین اور سحر شمیم۔

آئینہ نما (6) کے شمارے کی رسمِ اجراء (چند جھلکیاں)

آئینہ نما (6) کے شمارے کی رسمِ اجراء (چند جھلکیاں)

پریم شنکر جھا اور وید بھسین شہناز بشیر کو ''کشمیر ٹائمز'' کا قائم کردہ
شمیم احمد شمیم ایوارڈ دیتے ہوئے

آئینہ نما (6) کے شمارے کی رسمِ اجراء (چند جھلکیاں)

ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

پاکستان میں پانچ ہفتے گذارنے کے بعد جب میں ۲۴ رفروری کو اپنے گھر لوٹ رہا تھا تو حسینی والا سرحد پر میرے بہت سے عزیز و اقارب مجھے الوداع کہنے کے لیے آئے تھے، جوں جوں جدائی کا وقت قریب آ رہا تھا ان کی آنکھیں نمناک ہوتی جارہی تھیں اور پھر جب ساری کاغذی کاروائیاں مکمل ہوگئیں اور میرے لیے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھنے کا لمحہ آ گیا تو چچا رحیم اوران کی بیگم مجھ سے گلے مل کر کچھ اس طرح روئے کہ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ ہم لوگ کچھ اس طرح جدا ہو رہے تھے، کہ جیسے پھر کبھی ملنے کا امکان ہی نہ ہو، حسینی والا کی سرحد پر ہر روز سینکڑوں ہی ایسے رقت انگیز مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ برسوں کے بچھڑے ہوئے بھائی بہن، باپ بیٹا، ماں بیٹی، بیوی اور شوہر جب ملتے ہیں تو آنسوؤں کی خیرات دے کر اپنی خوش قسمتی کی نظر اُتارتے ہیں اور جب ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں تو آنسوؤں کی برکھا سے حسینی والا کی سنگلاخ زمین کو تر کر دیتے ہیں۔ گذشتہ بیس بائیس برسوں میں اس جگہ اتنے آنسو بہے ہوں گے کہ ان کو جمع کر کے نہ معلوم کتنی بنجر زمین سیراب ہوسکتی تھی مگر یہ صرف ان لوگوں کے آنسو ہیں جو برسوں کی عبادت اور ریاضت کے بعد حسینی والا تک پہنچ جاتے ہیں۔ اصل کہانی تو ان لوگوں کی ہے جو بیس بائیس برس کی جدوجہد کے باوجود بھی اس نقطے تک نہیں پہنچ پاتے اور ایسے بدقسمت لوگوں میں زیادہ تر تعداد میرے ان ہموطن کشمیری بھائیوں کی ہے جو گردش افلاک، امتدادِ زمانہ اور حادثاتِ روزگار کے ہاتھوں

مجبور ہوکر اپنے ہی وطن میں اجنبی بن گئے ہیں۔ لاہور، کراچی، راولپنڈی، ایبٹ آباد اور مظفر آباد میں مجھے ایسے سینکڑوں ہموطن ملے، جو آج پندرہ پندرہ بیس بیس سال سے اس انتظار میں بیٹھے ہیں کہ آج نہیں تو کل راستہ کھل جائے گا اور انہیں اپنے گھر لوٹنے کی اجازت مل جائے گی۔ بہت سے بزرگ یہی حسرت لے کر اس جہانِ فانی سے گذر گئے۔ جو زندہ ہیں وہ حسرت و یاس کی تصویر بنے انتظار کی کٹھن گھڑیاں گذار رہے ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو پاکستان کو اپنے خوابوں کی جنت سمجھ کر اپنا سب کچھ چھوڑ کر وہاں گئے، وہ لوگ بھی ہیں جنہیں اپنی مرضی کے خلاف وہاں بھیجا گیا۔ وہ بھی ہیں جو ملک کی تقسیم کے وقت وہاں تھے اور واپس نہ آسکے اور وہ بھی جو حالات کے چکّر میں کچھ اس بُری طرح پھنس گئے کہ بڑی کوششوں کے بعد بھی نہ نکل سکے، ان بدقسمت بھائیوں کی غریب الوطنی کی وجوہات کچھ بھی کیوں نہ ہوں۔ ان کے دل میں اب صرف ایک ہی خواہش ہے اور وہ یہ کہ انہیں وطن لوٹنے کی اجازت مل جائے۔ وطن کی یاد میں یہ بدقسمت لوگ کچھ اس طرح بے قرار و مضطرب ہیں کہ ان کا درد دیکھا ہی نہیں جاسکتا۔ وہ کس کس طور پر اپنے درد کا اظہار کر رہے ہیں، یہ کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ بہت سے لوگ مجھے سرینگر کی سڑکوں، اور یہاں کے گلی کوچوں کا احوال کچھ اس انداز سے پوچھ رہے تھے، کہ جیسے اپنے عزیزوں کے بارے میں دریافت کر رہے ہوں۔ ایک غریب الوطن نے شکایت کی کہ ''سنا ہے آپ لوگوں نے اخروٹ کے درخت کاٹنا شروع کر دئے ہیں'' اور میں نے اُسے جھوٹی تسلی دی کہ نہیں ایسا نہیں ہوا ہے۔

میرے چالیس روزہ قیام کے دوران ایک بھی دن ایسا نہ گذرا ہوگا جب میں نے ہجر و انتظار کی روح فرسا کہانیاں نہ سنی ہوں اور جب میرے کانوں میں یہ آواز نہ گونجی ہو ''شمیم صاحب! کچھ کیجیے، میں اپنے وطن لوٹنا چاہتا ہوں''۔ ایک

نوجوان نے یہاں تک کہہ دیا، کہ میں پاسپورٹ اور ویزا کا انتظار کئے بغیر چلا آؤں گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ مجھے وہاں جیل میں رکھیں گے، پھر بھی یہ اطمینان تو ہوگا کہ میں سرینگر میں ہوں، نشاط وشالیمار سے کچھ میل کے فاصلے پر ہوں''۔

لاہور سے مظفر آباد اور مظفر آباد سے کراچی تک میں نے صرف یہی ایک آواز سنی، کہ ہم اپنے وطن جانا چاہتے ہیں۔ بیس سالہ غریب الوطنی نے ان بچاروں کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے اور ان میں سے اکثر لوگ جوانی میں ہی بوڑھے نظر آتے ہیں۔ میرے ان غریب الوطن بھائیوں نے کچھ اس انداز سے مجھے اپنا دُکھ درد سنایا ہے کہ میرے بس کی بات ہوتی تو میں ان سے کہتا کہ تم میرے ساتھ چلو، اپنے وطن میں تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا، لیکن وطن تک پہنچتے پہنچتے کئی گنڈا سنگھ اور حسینی والا ہیں، اس لیے میں سب کچھ سن کر بھی خاموش رہا۔

میں اب حسینی والا کے اس پار ہوں اور میرا روئے سخن ہندوستان کی مرکزی سرکار کے لیڈروں اور ریاستی حکمرانوں کی طرف ہے۔ جب تک پاکستان کی سرزمین پر ایک بھی ایسا کشمیری موجود ہے جو وطن لوٹنے کی خواہش کے باوجود اپنے وطن سے دور ہے، کشمیر کا مسئلہ قائم رہے گا جو غریب الوطن کشمیری اپنا وطن لوٹنا چاہتے ہیں۔ ان کی راہ میں دیوار بن کر حائل نہ ہو جایئے، کہ دشتِ غربت کی صحرا نوردی نے ان کے پاؤں چھلنی، ان کے دل زخمی، ان کی روحیں گھائل اور ان کے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا ہے۔ سرزمین پاکستان میں بہت سے ہم وطنوں کی لاشیں امانتاً دفن ہیں۔ ان کی روحیں جب تک بے قرار رہیں گی جب تک ان کے جسدِ خاکی کو دیارِ غیر سے اپنے وطن میں منتقل نہ کیا جائے۔

اربابِ اقتدار کو اس مسئلے پر سنجیدگی سے سوچنا ہوگا!

پاکستان میں چالیس دن

1

آج سے دو ماہ قبل پاکستان کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے میں نے قارئین ''آئینہ'' سے وعدہ کیا تھا کہ میں اپنے قیام پاکستان کی روداد لکھوں گا۔ میں نے اپنے جنوبی ہندوستان کے دورے کا احوال ختم کرتے ہوئے یہ اُمید ظاہر کی تھی کہ پاکستان کا سفرنامہ یقیناً زیادہ دلچسپ، رنگین اور سبق آموز ہوگا، پاکستان میں چالیس دن قیام کرنے کے بعد اب وطن لوٹا ہوں، تو اس مشکل میں پڑ گیا ہوں، کہ شروع کہاں سے کروں، یہ کہانی میری توقعات سے زیادہ دلچسپ، میری خواہشات سے زیادہ بھی زیادہ رنگین (کہ اس میں بے شمار نوجوانوں کا لہو بھی شامل ہے) اور میرے اندازوں سے بھی زیادہ سبق آموز بلکہ عبرت انگیز کہانی ہے۔ پاکستان میں آمریت کے خلاف عوامی بغاوت کا لاوایوں تو نومبر ۱۹۶۸ء میں ہی پکنا شروع ہوا تھا لیکن ابھی صدر ایوب کے ایوانِ اقتدار میں کسی قسم کی سراسیمگی یا بدحواسی کے آثار نہ پائے جاتے تھے۔ ۱۶ر جنوری کو میرے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی بغاوت اور انقلاب کا وہ لاوا پھوٹ پڑا کہ جس نے قصرِ سلطانی کی دیواروں میں ایسے ایسے گہرے شگاف کر دئے کہ ساری دنیا کو بنیادی جمہوریت کی ''حقیقت'' اور صدر ایوب کی عظمت کا فریب نظر آنے لگا۔ ۱۶ر جنوری کے بعد حالات کچھ اس برق رفتاری کے ساتھ بدلتے گئے کہ ان کی اہمیت اور معنویت کو اچھی طرح سمجھنا مشکل بن گیا اور ۲۴ر فروری کو جب میں لاہور سے حسینی والا کے لیے روانہ ہو رہا تھا تو راولپنڈی میں آمریت کا تاج عوامی رہنماؤں کے قدموں پر گر کر اپنی

زندگی کی خیرات مانگ رہا تھا۔ ۱۶ر جنوری سے ۲۴ر فروری تک صرف چالیس دن کا فاصلہ ہے لیکن ان چالیس دنوں کے اندر پاکستانی عوام نے پورے دس سال کا قرض ادا کیا اور میں نے اپنی آنکھوں سے جمہوریت کے پروانوں کو جس بہادری اور بے جگری سے آمریت اور مطلق العنانیت کے دیوِ استبداد سے ٹکراتے دیکھا ہے، اُس سے پاکستانی عوام کے لیے میرے دل میں بے پناہ عقیدت اور احترام کے جذبات پیدا ہوئے ہیں۔ بنیادی طور پر میرے پاکستان جانے کا مقصد اپنے عزیز و اقارب سے ملنا تھا جو عرصہ بیس سال سے اپنے ناکردہ گناہوں کی پاداش میں غریب الوطنی کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ میرے چچا ایم۔ اے۔ صابر جو ملک کی تقسیم سے قبل سرینگر سے ''البرق'' نام کا ایک ہفت روزہ پرچہ نکالا کرتے تھے اور ۱۹۴۹ء میں ان کی مرضی کے خلاف قیدیوں کے تبادلے میں پاکستان بھیجے گئے تھے، کی خواہش تھی کہ میں ان سے ملنے کے لیے کچھ دنوں کے لیے پاکستان آؤں۔ میرے دوسرے چچا مولوی عبدالرحیم، بشیر احمد اور مشتاق احمد فاروق بھی عرصہ بیس سال سے پاکستان ہی میں مقیم ہیں اور ان سے ملنے کی خواہش بھی شدید سے شدید تر ہوتی جارہی تھی۔ بیس سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا، اُس وقت میں تیرہ چودہ برس کا ایک بچہ تھا اور آج میں کئی بچوں کا باپ ہوں۔ میرے ذہن سے ان کی تصویریں بالکل محو ہوگئی تھیں اور اگر انجانے میں میری کہیں ان سے ملاقات ہو جاتی، تو ہم دونوں شاید ہی ایک دوسرے کو پہچان پاتے۔ صابر صاحب اپنے بڑھاپے کا واسطہ دے دے کر میرے ذوقِ سفر اور شوق دیدار کو بھڑکاتے رہے اور بالآخر میری کوششیں بارآور ہوگئیں اور ۱۶ر جنوری کو میں نے حسینی والا سرحد پار کرکے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔

پاکستان میں اپنے چالیس روزہ قیام کے دوران قریب قریب اپنے تمام عزیز و اقارب سے ملا اور ان کے دلوں میں امیدوں، آرزؤں اور حسرتوں کی نہ معلوم کتنی شمعیں روشن کر کے چلا آیا۔ اپنے جن بہن بھائیوں کو انگوٹھا چوستے ہوئے دیکھا تھا وہ آج مائیں اور باپ بن چکے ہیں۔ صابر صاحب، عبدالرحیم صاحب اور بشیر صاحب کے چہروں پر بیس سال کے گرد و غبار کی موٹی موٹی تہیں نظر آئیں۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں ایک بے نام سی چمک ضرور پیدا ہوئی۔ لیکن مجھے محسوس ہوا کہ کچھ دیر بعد یہ چمک آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوب گئی۔ جس جس سے ملتا وہ یہی پوچھتا کہ یہ خواب ہے کہ حقیقت؟ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا، کہ ہم ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔ انسان چاند پر پہنچ گیا ہے لیکن ایک کشمیری کے لیے سو میل کے فاصلے پر اپنے دوسرے کشمیری بھائیوں سے ملنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ میرے نزدیک یہی کشمیر کا مسئلہ ہے اور باقی جو کچھ ہے وہ اسی کی تفسیر اور تاویل ہے۔

پاکستان میں اپنے قیام کے دوران میں صرف اپنے عزیز و اقارب سے ہی نہیں ملا۔ مجھے سینکڑوں کشمیری مہاجروں، سرکاری افسروں، لیڈروں اور ادیبوں سے ملاقات کا شرف حاصل رہا اور میں چونکہ کشمیر کا پہلا اخبار نویس اور ممبر اسمبلی ہوں، جسے پاکستان اور آزاد کشمیر کا دورہ کرنے کی اجازت دی گئی تھی، اس لیے قدرتی طور پر میں نے زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ملنے کی کوشش کی اور مجھے خوشی ہے کہ میں ہر اس آدمی سے ملا جس سے مجھے ملنا چاہیے تھا میں حکومت پاکستان کا مشکور ہوں کہ اپنی مصروفیات کے باوجود حکومت نے مجھے ہر ممکن سہولیت بہم پہنچانے کی کوشش کی اور جہاں جہاں میں نے جانے کی خواہش ظاہر کی مجھے اس کی اجازت دی گئی۔ مجھے سرکاری طور پر منگلا ڈیم دکھانے لے جایا گیا اور مظفر آباد میں سرکاری مہمان خانے میں ٹھہرانے کی پیشکش بھی کی گئی۔

غرض یہ کہ پاکستان میں میرے قیام کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار بنانے کے لیے پاکستان کے ارباب اختیار نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ میں لاہور، راولپنڈی، ایبٹ آباد اور کراچی کے علاوہ مظفر آباد اور میر پور بھی گیا اور میں نے جن پاکستانی زعماء کے ساتھ ملاقات کی، ان میں پاکستان کے وزیر خارجہ مسٹر ارشد حسین، سابق وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو، ائیر مارشل اصغر خان، آغا شورش کشمیری اور آزاد کشمیر کے صدر عبد الحمید خان بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ میں سردار ابراہیم، کے۔ ایچ۔ خورشید اور میر واعظ احمد سے بھی ملا اور ان سے باہمی دلچسپی کے مسائل پر تبادلہ خیال کیا۔ خوش قسمتی سے میں نے پاکستان میں اپنے چالیس روزہ قیام کے دوران اپنی سرگرمیوں پر مبنی ایک ڈائری مرتب کی ہے اور میرا ارادہ ہے کہ اس ڈائری کی روشنی میں، میں اپنا سفرنامہ رقم کر کے قارئین ''آئینہ'' کو اپنے ساتھ پاکستان اور آزاد کشمیر کی سیر کراؤں۔ میں کوشش کروں گا کہ دیانت داری اور خلوص کے ساتھ اپنے مشاہدات اور تاثرت قلمبند کروں تا کہ ''آئینہ'' کے پڑھنے والوں کے سامنے حالات، واقعات اور صورت حال کی صحیح تصویر آجائے۔

یہ سفرنامہ سلسلہ وار شائع ہوگا اور اس میں ۱۶ر جنوری سے ۲۴ر فروری تک پاکستان میں میری مصروفیات کا احوال تفصیل کے ساتھ بیان ہوگا۔ پاکستان کے موجودہ بحران کے متعلق، میں اپنی رائے الگ سے ظاہر کروں گا کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میری اپنی رائے اور میرا فیصلہ صورت حالات کے بیان پر کسی طرح اثر انداز ہو، اپنے سفرنامے میں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ جن لوگوں نے مجھ سے دل کھول کر باتیں کی ہیں۔ ان کا نام ظاہر نہ ہونے پائے کیونکہ مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ جرمِ حق گوئی کی پاداش میں ان پر کوئی آسمان نہ ٹوٹ پڑے۔

2

۱۹۶۵ء سے قبل ہندوستان اور پاکستان کے درمیان آمد و رفت کے کئی راستے تھے۔ امرتسر سے واگہ ہوتے ہوئے لاہور تک ریل جاتی تھی۔ دہلی سے لاہور تک ایک ہوائی سروس بھی جاری تھی اور اسکے علاوہ حسینی والا کی سرحد سے بھی آیا جایا جاسکتا تھا لیکن ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد واگہ کی سرحد بھی بند ہوگئی ہے اور ہوائی سروس بھی! اب آمد و رفت کا صرف ایک ہی راستہ کھلا ہے اور وہ ہے حسینی والا (فیروز پور)!

۱۶؍جنوری کی صبح کو جب میں فیروز پور سے حسینی والا کی طرف روانہ ہوا تو میرے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہورہے تھے۔ اپنے عزیز و اقارب کے بیس بائیس برس بعد ملنے کی خواہش نے ایک اضطراب اور بےقراری کی سی کیفیت پیدا کردی تھی اور میں جلد از جلد پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھنا چاہتا تھا۔ میں چونکہ اس سے پہلے کبھی لاہور یا راولپنڈی نہیں گیا تھا، اس لیے میرے ذہن میں پاکستان کی عجیب عجیب تصویریں اُبھر رہی تھیں۔ میں نے تخیل کی مدد سے کئی بار لاہور، راولپنڈی، اسلام آباد، کراچی، پشاور اور پاکستان کے دوسرے شہروں کی تعمیر کی۔ لیکن جوں جوں میں پاکستان کی سرحد کے قریب ہوتا جارہا تھا، میری ذہنی تصویریں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوکر بکھرتی رہیں اور میں انہیں پھر سے ترتیب دینے کی سعی کرتا ہوا حسینی والا سرحد پر پہنچ گیا۔ حسینی والا پر اس وقت سو ڈیڑھ سو کے قریب مسافر موجود تھے۔ اُن میں زیادہ تر تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی۔ یہ سب لوگ پاکستان سے آرہے تھے یا پاکستان جارہے تھے۔ ایک سردار جی ایک بہت بڑے رجسٹر میں پاسپورٹ اور ویزا کی تفصیلات درج کررہے تھے۔ کچھ دیر بعد

میری باری آئی۔ میرے پاسپورٹ پر پیشے کے سامنے ''جرنلسٹ'' لکھا ہوا دیکھا تو سردار جی نے منٹوں کا کام سیکنڈوں میں کر دیا اور مجھ سے کہنے لگے کہ آپ نے کیوں نہیں بتایا کہ آپ اخبار نویس ہیں۔ آپ کو خواہ مخواہ انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔ میں نے خدا کا شکر اور سردار صاحب کا شکریہ ادا کیا کہ اتنی جلدی اور آسانی سے یہ نازک مرحلہ طے ہو گیا۔ سڑک کے ایک کنارے پر سکہ بدلنے کے لیے کچھ لوگ ایک میز سجائے بیٹھے تھے۔ ان سے زادِ راہ کے لیے کچھ ہندوستانی سکوں کے بدلے پاکستانی روپیہ حاصل کیا اور پاکستانی سرحد کی طرف روانہ ہوا۔ کسٹم اور دیگر لوازمات سے فارغ ہو کر ٹھیک بارہ بجے میں نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھے۔ پاکستان کی سرحد میں قدم رکھتے ہوئے میرے دل و دماغ میں ایک عجیب طرح کی ہل چل مچی ہوئی تھی اور مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ سچ ہے! پاکستان ایک لحاظ سے ہمارے لیے شہر ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہے اور آج بڑی مدت کے بعد پاکستان کو ایک نظر دیکھنے کا خواب پورا ہو رہا تھا۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ پاکستانی سرحد کا نام گنڈا سنگھ والا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ملک کی تقسیم کے بعد بھی حسینی ہندوستان میں اور گنڈا سنگھ پاکستان میں رہ گیا۔ یہ مذہب کے نام پر ملک کی تقسیم پر ایک طنز بھی ہے اور ایک عبرت ناک حقیقت بھی!

گنڈا سنگھ والا پر ایک پاکستانی بس کھڑی تھی۔ اس پر ''اومنی بس لاہور'' لکھا ہوا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا کہ کب روانہ ہوگی؟

''بارہ بجے!'' ڈرائیور نے جواب دیا۔

''مگر بارہ تو بج گئے''! میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں۔ ابھی ساڑھے گیارہ بجے ہیں! آپ کی گھڑی میں ہندوستانی ٹائم ہوگا''۔ پاکستانی ڈرائیور نے مجھے یاد دلایا۔ ہندوستان اور پاکستان کے

درمیان پہلا فرق واضح ہو گیا اور میں نے اپنی گھڑی کو آدھا گھنٹہ پیچھے کر دیا!

گنڈا سنگھ والا سے لاہور تک چالیس میل کا فاصلہ ہے اور راستے بھر میں پاکستان اور ہندوستان کے فرق کو سمجھنے اور محسوس کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لاہور پہنچتے پہنچتے مجھ پر دونوں ملکوں کے درمیان ایک اور فرق نظر آیا۔ سڑک کے دونوں طرف لگے ہوئے سنگ میل اُردو میں لکھے ہوئے تھے۔ اپنے یہاں انگریزی ہوتی ہے یا ہندی!

میں نے جان بوجھ کر کسی کو اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ غیر متوقع طور پر پہنچ کر اپنے رشتہ داروں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دوں گا! یہ تجربہ میرے لیے بہت مہنگا ثابت ہوا۔ مزنگ چوکی کے قریب اُتر کر جب میں نے چچا عبدالرحیم کی کوٹھی کا اتا پتا دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ میرے پاس ''کشمیر پارک'' کے نام سے جو پتہ ہے وہ غلط تو تھا ہی، گمراہ کن بھی ثابت ہوا۔ ٹھیک دو گھنٹے کی تلاش کے بعد بھی کشمیر پارک کا حدودِ اربعہ معلوم نہ ہو سکا! وجود ہوتا تو پتہ چلتا۔ پورے لاہور میں اس نام کا کوئی پارک ہی نہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ رحیم صاحب نے اپنے مکان کے ساتھ والے باغ کا نام اپنے طور پر کشمیر پارک رکھا ہے اور ڈاکیے کے سوا کسی دوسرے کو یہ نام معلوم ہی نہیں۔ اجنبی شہر، کسی سے جان نہ پہچان، میں دو گھنٹے کی تلاش کے بعد اتنا تھک گیا کہ مجھے اب اپنے اوپر ہی غصہ آنے لگا کہ میں نے اپنی آمد کی اطلاع کیوں نہ دی تھی۔ دفعتاً مجھے یاد آیا کہ میرے پاس بارہمولہ کے عنایت اللہ صاحب ککرو کے بھائی خواجہ حبیب اللہ کا پتہ ہے اور میں خواجہ صاحب کی دریافت کے لیے چل پڑا۔ خواجہ صاحب کی دکان مال روڈ پر ایک نہایت عالی شان عمارت، ''الفلاح'' میں ہے اور پوچھتے پاچھتے میں ان کی دُکان "Hibson & Co" پر پہنچ گیا۔ معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب گھر گئے ہوئے

ہیں اور آنے ہی والے ہیں۔ میں نے اپنا سامان رکھ دیا اور دفتر میں بیٹھ کر خواجہ حبیب اللہ کا انتظار کرنے لگا۔ خواجہ صاحب کی دکان کے ایک ملازم کو پتہ چلا کہ میں کشمیر سے آیا ہوں تو میرے پاس آ کر بیٹھ گئے اور مجھ سے وہی سوال کیا جو پاکستان میں چالیس روز قیام کے دوران مجھ سے کم از کم چار ہزار مرتبہ پوچھا گیا۔

''سنایئے وہاں کشمیر کا کیا حال ہے۔ وہ لوگ کیا چاہتے ہیں''؟

''وہ تو میں آپ کو فرصت سے سناؤں گا۔ فی الحال مجھے آپ یہ سنایئے کہ پاکستان کا کیا حال ہے اور یہاں کے لوگ کیا چاہتے ہیں''؟ میں نے سوال کرنے والے سے پوچھا دراصل مجھ میں سنانے کی ہمت نہیں تھی اور میں خاموشی سے ان ہی کی بات سننا چاہتا تھا۔

''پاکستان میں پچھلے دس برسوں میں کافی ترقی ہوئی ہے۔ کمپنی کے ملازم نے جو غالباً اکاؤنٹنٹ تھے سنانا شروع کر دیا۔ ''لیکن اسی حساب سے چیزوں کی قیمتیں بھی بڑھ گئی ہیں، خاص طور پر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد سے تو قیمتوں میں کئی گناہ اضافہ ہوا ہے۔ امیر لوگ تو پہلے سے زیادہ امیر ہو گئے ہیں لیکن عام آدمی کو کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے بلکہ روز بروز اس کا کچومر نکلا جا رہا ہے۔

اب رہا یہ کہ پاکستان کے لوگ کیا چاہتے ہیں؟ وہ اس وقت تو صدر ایوب سے چھٹکارا چاہتے ہیں لیکن ان کی اصلی خواہش یہ ہے کہ کشمیر پاکستان کا حصہ بنے۔ اکاؤنٹنٹ صاحب ابھی اس کی تشریح کرنے ہی والے تھے کہ خواجہ حبیب اللہ تشریف لائے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور اپنی مشکل بھی بیان کر دی۔ خواجہ صاحب بڑے خوش اخلاق ملنسار اور زندہ دل ہونے کے علاوہ بڑے خوش حال بھی ہیں۔ پاکستان میں ان کا بڑا اثر و رسوخ ہے اور اقتدار کے اونچے اونچے ایوانوں تک ان کی رسائی ہے۔ غالباً اسی جرم کی پاداش میں حالیہ ہنگاموں کے

دوران ان کی دکان کے کچھ شیشے بھی مجروح ہوگئے۔ انہوں نے دکان پر بیٹھے بیٹھے ہی عبدالرحیم صاحب کی کوٹھی کا جغرافیہ معلوم کرلیا اور مجھے کسی حد تک اطمینان ہوگیا۔ اسی دوران میں منظور الحق ڈار صاحب راولپنڈی سے تشریف لائے اور گفتگو کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ جو شام تک جاری رہا۔ شام کو میں چوبرجی پارک میں عبدالرحیم صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ تو معلوم ہوا کہ چچا جان میری تلاش میں ''الفلاح'' گئے ہوئے ہیں۔ کچھ دیر بعد وہ آگئے۔ مجھے دیکھتے ہی مجھ سے لپٹ کر رونے لگے۔ ''ارے! تم اتنے بڑے ہوگئے ہو۔ تم اتنے سے تو تھے''۔ چچا جان نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''اور آپ اتنے بوڑھے ہوگئے ہیں'' میں پوچھنا چاہتا تھا، لیکن میں نے پوچھا نہیں!

چچا رحیم اس دور کی یادگار ہیں جب تحریک حریت کا مقصد صرف ریاستی مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں نمائندگی دلانے کے لیے جدوجہد کرنا تھا وہ ۱۹۳۱ء میں شیخ صاحب کے ساتھ ہی گرفتار کر لئے گئے اور خود شیخ صاحب نے مجھ سے ایک بار کہا کہ اگر مولوی عبدالرحیم سیاست چھوڑ کر ملازمت اختیار نہ کرتے تو اپنی دیانت داری، راست بازی اور اصول پرستی کی وجہ سے کشمیر کی سیاسی تاریخ میں ان کا بہت اونچا مقام ہوتا اور شیخ صاحب ہی کے الفاظ میں ''تحریک حریت کے ابتدائی ایام میں مولوی محمد عبداللہ (دادا مرحوم) اور مولوی عبدالرحیم کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا''۔ جب مولوی صاحب ۱۹۴۹ء میں پاکستان بھیجے گئے تو میں شوپیان میں آٹھویں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ مجھے انکے بارے میں صرف یہ یاد ہے کہ وہ سبز پگڑی پہنتے تھے اور ہاتھ میں چھڑی لے کر چلتے تھے۔

❁❁❁

3

ان کی دیانت داری اور فرض شناسی کی سب تعریف کرتے تھے۔ وہ کٹر قسم کے مسلمان، بڑے دلیر، صاف گو اور بے خوف آدمی تھے۔ میں ذہنی طور ان سے خائف تھا۔ اس لیے کبھی ان سے بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ پھر ایک دن یہ سننے میں آیا کہ انہوں نے شالی سٹور میں بخشی غلام محمد کی طرف سے بلائی گئی سرکاری افسروں کی ایک میٹنگ میں کوئی سخت قسم کی باغیانہ تقریر کی ہے اور انہیں کسی بھی وقت گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ وہ ان دنوں سٹی مجسٹریٹ تھے اور میں نے کہیں سے یہ سن رکھا تھا کہ جج کو کوئی گرفتار نہیں کر سکتا۔ پھر جب کچھ ہی دنوں بعد وہ گرفتار کر لئے گئے، تو مجھے اندازہ ہوا کہ ملک کا قانون بدل گیا ہے۔

کھانا کھانے کے بعد چچا رحیم نے مجھے اپنی روداد سنائی کہ انہیں کس طرح اپنے وطن کو خیر باد کہنا پڑا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ شالی سٹور میں منعقدہ میٹنگ میں شہر کے سبھی بڑے افسر موجود تھے۔ شیخ صاحب ان دنوں نیویارک میں تھے اور یہ میٹنگ بخشی صاحب نے بلائی تھی۔ بخشی صاحب نے اس میٹنگ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہم ہر سرکاری ملازم سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ حکومت وقت کا وفادار رہے، چچا رحیم کے الفاظ میں "بخشی کی تقریر میں حکم اور دباؤ کا لہجہ نمایاں تھا اور جب اسکے بعد انہیں تقریر کرنے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے کہا کہ ہم اس طرح حکومتِ وقت کی اطاعت کریں گے جس طرح حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی کی تھی"۔ بخشی صاحب کا چہرہ تمتما اٹھا اور میرے کچھ دوستوں نے مجھے وہیں بتا دیا کہ مجھے نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہنا

چاہیے، یہ ۱۹۴۸ء کی بات تھی!

پھر چچا رحیم نے مجھے بتایا کہ کس طرح انہیں سوچیت گڈھ کے راستے پاکستان بھیجا گیا۔ وہ قیدیوں کے تبادلے میں پاکستان بھیجے جارہے تھے، لیکن وہ نہیں جانا چاہتے تھے۔ ریاستی حکومت کی طرف سے شری شیام لعل صراف کو انہیں ''الوداع'' کہنے کے لیے سوچیت گڑھ بھیجا گیا تھا۔ وطن سے بے وطن ہونے کا یہ احوال خود مولوی صاحب ہی کی زبان سے سنئے۔

''سوچیت گڈھ کے مقام پر جب مجھ سے پاکستانی سرحد میں داخل ہونے کے لیے کہا گیا تو میں نے انکار کردیا۔ میں نے کہا کہ میں کشمیر چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ شری شیام لعل صراف نے مجھ سے کہا کہ مولوی صاحب آپ کیا کر رہے ہیں۔ آپ باقاعدہ ایک معاہدے کے تحت بھیجے جارہے ہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔

میں نے کہا نہیں، میں نہیں جاؤں گا۔ میں ابھی اپنی ضد پر اڑا ہی تھا کہ میں نے دیکھا کہ میرے بیوی بچے سرحد پار کر کے پاکستان کی حدود کے اندر داخل ہوگئے ہیں۔ ناچار میرے قدم بھی پاکستان کی طرف اٹھنے لگے اور چند لمحوں کے بعد میں پاکستان میں تھا۔ اس وقت ہم اس خیال سے آئے تھے کہ ایک یا دو مہینے تک اپنے گھروں کو لوٹیں گے۔ اس لیے کپڑوں کے دو دو جوڑے اور شیو کا سامان ہی ساتھ لائے تھے۔ کسے معلوم تھا کہ دو مہینے بیس برس بن جائیں گے اور پھر اپنے وطن لوٹنے کی حسرت بھی دم توڑ جائے گی۔

مولوی صاحب اور میں رات گئے تک باتیں کرتے رہے وہ بار بار شیخ صاحب کا ذکر کرتے اور کچھ اس عقیدت سے کرتے رہے کہ مجھے حیرت ہو رہی تھی، میں نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔ شیخ صاحب ہی نے تو آپ کو یہاں بھیجا

پھر آپ اس عقیدت سے ان کا ذکر کیوں کرتے ہیں۔

''وہ حالات کا تقاضا تھا، میں ان کی جگہ ہوتا تو یہی کرتا۔انہوں نے افراد کے ساتھ کیا کیا، یہ بڑی چھوٹی بات ہے، بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے قوم کا ساتھ دیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، ٹھیک کر رہے ہیں''۔ مولوی صاحب نے جواب دیا مجھے محسوس ہوا کہ اس غریب الوطنی میں شیخ صاحب کے تئیں ان کی عقیدت اور احترام میں اضافہ ہوا ہے کمی نہیں۔

کچھ دیر بعد پریم ناتھ بزاز کا ذکر چل پڑا اور مولوی صاحب نے مجھے اپنی ابتدائی زندگی کے کچھ واقعات سنائے کہ کس طرح بزاز صاحب نے ان کی مدد اور رہنمائی کی، کہنے لگے ''پریم ناتھ بزاز کو میں اپنا استاد مانتا ہوں۔ وہ بڑا ہی سیکولر اور روشن دماغ آدمی ہے۔ ہم لوگ تو اُسے پیدائشی مسلمان سمجھتے تھے۔ میں نے شروع میں جب ''اخبار صداقت'' جاری کر دیا تھا تو اس کا خرچہ تک بزاز صاحب برداشت کرتے تھے۔ حالانکہ یہ اخبار مسلمانوں کے لیے ملازمتوں میں نمائندگی حاصل کرنے کے لیے وقف تھا''۔

رات کا ایک بج چکا تھا، ہندوستانی وقت کے مطابق اس وقت ڈیڑھ بجا تھا لیکن میری آنکھوں میں نیند کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ مولوی صاحب مجھ سے طرح طرح کے سوالات پوچھ کر کشمیر کی ذہنی سیاحت کر رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا.........................

میرے پاکستان جانے سے پہلے ہندوستانی اخبارات میں پاکستان کی اندرونی بے چینی اور اضطراب کے متعلق خبریں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ لیکن بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح میں انہیں ''پروپیگنڈا'' اور مبالغہ آمیزی سے تعبیر کر کے یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ ہندوستان کا ریڈیو اور یہاں کے اخبارات

دراصل رائی کا پہاڑ بنا رہے ہیں۔ پاکستان میں وارد ہونے کے دوسرے ہی دن مجھے اندازہ ہوا کہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہندوستان میں کسی کو پاکستان کی صحیح صورت حال کا علم تو کیا اندازہ بھی نہیں تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہاں پہاڑ کو رائی بنا کر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ صدر ایوب کے خلاف پاکستانی عوام کے غیض و غضب اور ان کی برہمی کا نظارہ کچھ دیکھنے سے ہی تعلق رکھتا تھا اور جو لوگ پورے دس سال تک صدر ایوب اور پاکستان کو لازم و ملزوم سمجھتے آئے ہیں، ان کے لیے اس بغاوت کی عناصر ترکیبی، اس کے فوری محرکات اور اس کی پوری شدت کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ مجھ سے اکثر لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ آخر صدر ایوب کے خلاف پاکستانی عوام کی اس بے پناہ نفرت اور بیزاری کا سبب کیا ہے؟ عام آدمیوں کے لیے ہی نہیں، بڑے بڑے سیاسی پنڈتوں کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو گیا ہے کہ جس آدمی نے پاکستان کو عزت دی، استحکام اور استقلال بخشا، صنعتی اور اقتصادی ترقی کی راہ پر گامزن کیا، وہ عوامی نفرت، حقارت اور بیزاری کا مرکز کیونکر بن گیا۔ پاکستان میں اپنے قیام کے ابتدائی ایام میں خود میرے لیے یہ بات ایک معمہ بنی ہوئی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ مجھ پر اس بغاوت کے اسرار کھلنے لگے اور میں یہ سوچنے لگا کہ پاکستانی عوام نے پورے دس سال تک آمریت کو قبول کر کے اپنے اوپر سخت جبر کیا تھا اور آج وہ اسی کا کفارہ ادا کر رہے ہیں۔ مگر بقول ایک پاکستانی نوجوان کے "ہم نے آمریت کو کبھی قبول نہیں کیا تھا۔ ہم سیاستدانوں کی بے راہ روی سے ان زنجیروں میں باندھ دئے گئے تھے اور جب زنجیروں کا بوجھ اتنا بڑھ گیا کہ ناقابل برداشت ہو گیا، تو ہم نے زنجیریں توڑنے کا فیصلہ کیا"۔ یہاں بیٹھ کر صدر ایوب اور اس کے ساتھیوں کے خلاف پاکستانی عوام کے

جذبات کی شدت کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے ہم تک صرف خبریں پہنچ جاتی ہیں۔ جذبات کی وہ آنچ نہیں پہنچ سکتی، جو ان خبروں کو جنم دیتی ہے۔ لاہور میں اپنے قیام کے دوسرے ہی دن، مجھے اس آگ کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا جو دو تین دن بعد پورے پاکستان میں کچھ اس طرح پھیل گئی کہ ابھی تک نہیں بجھ پائی۔

یہ جمعہ کا دن تھا اور نماز کے بعد بیرون موچی دروازہ جمہوری مجلس عمل کا جلسہ ہونے والا تھا۔ میں جلسہ گاہ میں پہنچا تو وہاں تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ۳۰ ہزار سے کم کا اجتماع نہ تھا۔ میرے پہنچتے ہی جلسہ کی کاروائی شروع ہوگئی۔ ایک صاحب لپک لپک کر نظم پڑھنے لگے۔ نظم کا عنوان تھا ''چوکیدار'' اور اس میں بڑے لطیف انداز میں صدر کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ نظم کے ایک ایک مصرع پر وہ داد ملی، کہ خدا کی پناہ! اس کے بعد مجلس عمل کے مختلف لیڈروں نے تقریریں کیں اور جس لیڈر نے صدر کو جتنی گالیاں دیں، اتنی ہی اس کو داد ملی۔ مقررین میں کونسل مسلم لیگ کے صدر اور پنجاب کے سابق وزیرِاعلیٰ میاں ممتاز دولتانہ اور ہفت روزہ ''چٹان'' کے ایڈیٹر شورش کاشمیری بھی شامل تھے۔ ان دونوں صاحبان کی تقریریں زبان و بیان کے لحاظ سے بڑی دلچسپ اور رنگین تھیں اور انہیں جی بھر کر سامعین نے داد دی۔ میاں ممتاز دولتانہ ان پرانے مسلم لیگیوں میں سے ہیں، جنہوں نے پاکستان کی تحریک میں بھرپور حصہ لیا ہے۔ وہ بہت اچھے اور سلجھے ہوئے مقرر ہیں اور انہوں نے اپنی تقریر سے ایک سماں باندھ دیا۔ اس تقریر کے کچھ اقتباسات آپ بھی سن لیجئے۔

''پاکستان تو برصغیر کے پندرہ کروڑ مسلمانوں نے بنایا ہے۔ کسی نقلی فیلڈ مارشل نے تو نہیں بنایا تھا۔ پھر آج اس ملک پر یہ نقلی فیلڈ مارشل کیوں حکمران ہے؟

پاکستان کو اس بات پر فخر ہے کہ یہ ملک جمہوریت کے بطن سے بنا ہے اور ستم ظریفی دیکھئے کہ آج اس ملک میں جمہوریت کا نام لینا جرم ہے۔ دوسرے ملکوں نے جمہوریت کو صرف اپنایا ہے لیکن پاکستان تو جمہوریت کی تخلیق ہے اور یہاں جمہوریت نہ ہو، یہ پاکستانی عوام کے لیے کتنے شرم کی بات ہے۔ میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان کو تب تک کشمیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ اس ملک میں جمہوریت نہ ہو۔ آخر کشمیر پر ہمارا حق ہے۔ یہی کہ ہم وہاں کے لوگوں کے لیے جمہوریت کا حق مانگتے ہیں۔ لیکن جب ہمارے اپنے ہی ملک میں جمہوریت نہ ہو تو پھر ہم کشمیر کو کس طرح حاصل کر سکتے ہیں۔

پاکستان کی اقتصادی حالت تباہ و برباد ہے۔ بیس گھرانوں نے ملک کی ساری دولت سمیٹ لی ہے۔ صدر ایوب پاکستان کے بالغوں کو اس لیے رائے دہندگی کا حق نہیں دیتے، کہ وہ پاکستانی عوام کو جاہل سمجھتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ جب پاکستانی عوام پاکستان کے لیے جدوجہد کر رہے تھے تو صدر ایوب کہاں تھے۔ انہوں نے پاکستان بنانے میں کوئی محنت تو نہیں کی، وہ تو اس وقت انگریز سے تنخواہ لیتے تھے۔ ہزارے کا یہ خود ساختہ فیلڈ مارشل ۴۵ر احمقوں اور ۱۳ر نورتنوں کے سہارے پاکستان پر حکومت کر رہا ہے اور اس کی کابینہ میں ایک سے ایک بڑھ کر احمق اور بیوقوف موجود ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پورے ملک میں چراغ لے کر بھی ڈھونڈو، تو صدر ایوب کے وزیروں جیسا کوئی احمق نہ ملے گا۔ صدر نے جان بوجھ کران بیوقوفوں کا انتخاب کیا ہے کہ

پسلی پھڑک گئی نگاہِ انتخاب سے

صدر ایوب طالب علموں اور وکیلوں کا دشمن ہے۔ وہ دانشوروں اور ادیبوں کا دشمن ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ عقل، ضمیر اور دیانت داری کا دشمن

ہے۔ وہ بے ایمانی سہہ سکتا ہے، کنبہ پروری اور رشوت ستانی سہہ سکتا ہے لیکن عقل اور ضمیر کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ بالغوں کو اس لیے حق رائے دہندگی نہیں دیتا کہ اُسے اس بات کا خوف ہے کہ بالغوں کے حق کا سب سے پہلا نشانہ وہ خود ہو گا جمہوری مجلس عمل نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ آنے والے صدارتی انتخابات کا بائیکاٹ کرے گی۔ آپ سب لوگوں کو انتخابات کا بائیکاٹ کرنا چاہیے کیونکہ صدر کے ہوتے ہوئے انتخابات محض فراڈ ہیں۔ اس سے پہلے مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح نے بھی انتخاب لڑا تھا۔ ہم نے اس انتخاب کا حشر دیکھ لیا۔ ووٹ مادر ملت کے حق میں پڑے، لیکن بکسوں سے صدر ایوب کے ووٹ نکلے (مجھے کشمیر کے انتخابات یاد آئے) اب کی بار ہم انتخابات میں حصہ نہیں لیں گے۔ کیونکہ اگر ہم نے انتخابات میں حصہ لیا، تو دنیا کہے گی کہ تم نے تو یہ نظام قبول کر لیا ہے۔ اس لیے ہم انتخابات نہ لڑیں گے (مجھے شیخ صاحب اور بیگ صاحب کا فلسفہ یاد آیا)۔

دولتانہ صاحب کی تقریر میں جب کبھی ذوالفقار علی بھٹو کا نام آیا، حاضرین نے پرزور تالیاں بجا بجا کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا اور میں پاکستانی سیاست کے مزاج سے کچھ کچھ آشنا ہونے لگا، اسکے بعد شورش کاشمیری کا نام پکارا گیا تو سارے مجمع میں ایک ہل چل مچ گئی اور شورش کاشمیری زندہ باد کے نعروں سے فضا گونجنے لگی۔ شورش کشمیری ہفت روزہ ''چٹان'' کے ایڈیٹر ہیں۔ انہیں چھ ماہ پہلے نظر بند کر کے ان کے اخبار کو بند کر دیا گیا تھا اور ساتھ ہی اس کا پریس بھی ضبط کر دیا تھا۔ انہوں نے کراچی جیل میں کئی دن بھوک ہڑتال کی تھی اور ابھی حال ہی میں ہائی کورٹ نے ان کو رہا کر دیا تھا۔ شورش بڑے آتش قلم صحافی اور آتش بیان مقرر ہیں۔ فن خطابت میں ان کا استاد سید عطا اللہ شاہ بخاری ہے

جو چھ چھ سات سات گھنٹے تقریر کرتا تھا اور تقریر بھی ایسی کہ ہزاروں کا مجمع رات بھر ان کی تقریریں سن کر ان کی جادو بیانی پر سر دھنتا۔ شورش کی تقریر میں وہ غضب کی روانی ہے کہ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ایک تند و تیز دریا ہے جس میں الفاظ کی طغیانی آئی ہوئی ہے۔ بعد میں جب مجھے شورش سے ملنے کا اتفاق ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ آدمی بے حد ذہین، فطین اور بہادر ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا عاشق ہے اور پاکستان میں سب سے پہلے جس آدمی نے کھل کر مولانا آزاد کی مدح کی وہ شورش ہی ہیں۔ انہوں نے ''چٹان'' کا ایک خوبصورت ابوالکلام نمبر نکالا، جو بقول ان کے پاکستان میں ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ شورش کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنی خطابت کے سحر سے مسحور ہو کر پھکڑ بازی پر اُتر آتا ہے۔ لاہور میں اپنے قیام کے دوران میں نے کئی بار اس کی تقریریں سنیں۔ وہ داد و تحسین حاصل کرنے کے لیے نچلی سے نچلی سطح تک آنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ موچی باغ کے اس جلسے میں شورش کی تقریر میں شکوہ الفاظ اور پھکڑ بازی کے سوا کچھ نہ تھا اور اس لیے اس کے ایک ایک جملے پر انہیں قہقہوں کی داد ملتی رہی، کچھ جملے آپ بھی سنیئے:

''پاکستان میں اس وقت ڈی پی اے (ڈیفنس آف پاکستان ایکٹ) یعنی ڈیفنس آف پریذیڈنٹ ایکٹ بلکہ یوں کہیے کہ ڈیفنس آف پروسٹی چیوشن ایکٹ قائم ہے........'' صدر ایوب (ارے بھائی معاف کرنا کس کم بخت کا نام لیا، میرا وضو ٹوٹ گیا) کو عنقریب ہی اسی جیل میں رکھا جائے گا، جہاں اُس نے مجھے قید رکھا۔ میں مجلسِ عمل کے لیڈروں سے درخواست کروں گا کہ اُسے جس جیل میں رکھا جائے گا مجھے اس جیل کا سپرانٹنڈنٹ بنایا جائے۔ میں دولتانہ صاحب سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں جیل خانے کا نظام قانون کے

مطابق چلاؤں گا۔صدر کی طرح وہاں بھی لاقانونیت رائج نہیں کروں گا۔" یہ
کاغذی فیلڈ مارشل پنجابیوں کو سندھیوں سے، بنگالیوں کو پنجابیوں سے اور
پٹھانوں کو آپس میں لڑاتا رہتا ہے.......... "کراچی جیل میں ایک بلوچ قیدی
نے مجھ سے کہا کہ صدر نے ایک دن میں میرے چودہ بھائی قتل کروائے، لیکن
پاکستانی اخبارات نے اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا"۔

"۱۹۶۵ء کی جنگ تو صدر ایوب کے خیال میں انکی خالہ نور جہاں نے
لڑی ہے۔جس کے نغموں نے ہمارے فوجی نوجوانوں کا لہو گرمایا۔اس لیے نور
جہاں کو ستارۂ پاکستان مل گیا۔لیکن ان ماؤں کا کسی نے ذکر تک نہ کیا کہ جو
رات کی تنہائیوں میں قرآن پڑھ پڑھ کر اپنے بیٹوں کی شہادت کی دعائیں
مانگتی رہیں۔صدر ایوب بھول گئے کہ ۶۵ء کی جنگ ان کی توپوں اور ٹینکوں نے
انہی ماؤں کی دعاؤں سے لڑی ہے جو میدانِ جنگ میں اپنے لختِ جگر کو
بہادری اور جوانمردی کا سبق پڑھاتی رہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ کسی کا
لخت جگر مرے مگر حکومت صدر اور اس کے بیٹے کریں"۔

"کل میرے پاس میرا ایک دوست گھبرایا ہوا آیا۔ کہنے لگا بڑی مشکل
میں ہوں، میں نے کہا خیریت تو ہے۔ بولا میری بیوی کئی دن سے دردِزہ میں
مبتلا ہے۔ میں نے کہا کسی ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتے، کہنے لگا وہ بھی کیا، میں
نے کہا کسی تجربہ کار دایہ کو گھر بلوالو، کہا وہ بھی کیا، لیکن فی الحال کوئی صورت نظر
نہیں آتی۔ میں نے پوچھا بات کیا ہے، کہنے لگا، اندر سے آواز آرہی ہے کہ
تب تک نہیں نکلوں گا، جب تک ذوالفقار علی بھٹو نہیں نکلے گا (بھٹو ان دنوں
نظر بند تھے)۔

"صدر ایوب کہتے ہیں میں مرزائی نہیں ہوں، میں کہتا ہوں کہ مرزائی

نہیں ہوتو اور کیا ہو، تم نے مولوی عبیداللہ کے سینے پر لاٹھیاں چلوائیں یا نہیں اور تم جانتے تھے کہ مولوی عبیداللہ کے سینے میں قرآن ہے۔

''صدر اس خبط میں مبتلا ہے کہ اسی ہزار مراثی یعنی بی ڈی ممبر اس کے ساتھ ہیں۔ اُسے جلد ہی معلوم ہوگا کہ یہ مراثی (بی۔ ڈی۔ ممبرس) بھی اس کے ساتھ نہیں۔

''میں یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ پاکستان ٹائمز، امروز، مشرق، اتفاق اور ان تمام اخبارات کو ان کے اصل مالکوں کے حوالے کر دو۔ جن کو تم نے غصب کر دیا ہے۔ 'چٹان' تو تمہیں بہر حال واپس کرنا ہوگا۔ لیکن اگر چٹان کا پریس، اپنی بیٹیوں کو جہیز میں نہیں دیا ہے تو وہ بھی واپس کر دو۔

''میں صدر اور ان کے حواریوں سے کہتا ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ، فوراً چلے جاؤ، مگر اپنا بینک بیلنس یہیں چھوڑ جانا۔

''گولیاں چلواتے ہو معصوم بچوں کے سینے پر؟ اس لیے کہ یہ بچے تمہاری موٹروں پر پتھراؤ کرتے انہیں مجروح کرتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ تمہاری موٹروں کے شیشے ہمارے بچوں کے جگر سے زیادہ قیمتی ہیں کیا؟ ......'' ''صدر کے مشیروں کا کیا کہنا، یہ جاہلانِ مطلق جو دار العوام کو ولد الحرام پڑھتے ہیں اور خود صدر ایوب کا نام عین سے لکھتے ہیں، یعنی صدر عیوب'' یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ شورش کے ایک ایک جملے پر داد تحسین کے نعرے بلند ہوتے رہے۔

میں نے کچھ تفصیل کے ساتھ اس جلسے کی روداد لکھی ہے تاکہ قارئین کو یہ اندازہ ہو کہ صدر ایوب کے خلاف عوامی جذبات کو کس کس طرح ابھارا جا رہا تھا اور عام جلسوں کی فضا کیسی ہوا کرتی تھی۔ راولپنڈی اور کراچی میں مجھے مخالف لیڈروں کی جتنی تقریریں سننے کا موقع ملا ان میں پھر پھر کر یہی چند باتیں

دہرائی جاتی تھیں۔ کچھ جلسوں میں صدر ایوب سے زیادہ ان کے بیٹوں کی دھاندلیوں کے قصے دہرائے جاتے۔ موچی دروازہ کے جلسے میں مجھے پہلی بار یہ اندازہ ہوا کہ صدر ایوب کے خلاف پاکستانی عوام کی نفرت کتنی شدید اور گہری ہے۔

جلسے میں ایوب کتا مردہ باد کے نعرے لگ رہے تھے اور میں خاموشی سے سن رہا تھا۔ میری خاموشی پر حیران ہو کر ایک آدمی دوسرے آدمی سے سرگوشی کے انداز میں کہہ رہا تھا ''سالا! ایوب کا آدمی معلوم ہوتا ہے''۔ اس کے بعد میں نے بھی زور سے مردہ باد کے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔

جلسے کے اختتام پر اجتماع نے ایک جلوس کی شکل اختیار کی، جو رنگ محل اور مال روڈ سے ہوتا ہوا اسمبلی ہال کے باہر ختم ہوا۔ لاہور کا ہر جلوس جب تک مال روڈ پر سے نہ گذرتا اُسے جلوس نہیں سمجھا جاتا۔ اس کے بعد سے میں نے مال روڈ پر اتنے جلوس گذرتے دیکھے ہیں کہ مجھے ان کی تعداد کا بھی اندازہ نہیں۔ لاہور میں اپنے قیام کے دوران میں نے اپنی ڈائری میں تین باتیں نوٹ کر لیں۔

(۱) یہاں ٹیکسی کی شرح کرایہ ہمارے ہاں کے مقابلے میں نصف ہے یعنی ۸/ر فی میل پورے پاکستان میں یہی شرح ہے۔ (۲) یہاں ٹیلی ویژن نے بڑی ترقی کی ہے جس طرح ہمارے ہاں ریڈیو عام ہیں، پاکستان میں اسی طرح ٹیلی ویژن عام ہوتا جا رہا ہے بعد میں معلوم ہوا کہ کراچی، راولپنڈی اور ڈھاکہ میں ٹیلی ویژن کے الگ الگ سٹیشن قائم ہیں۔ (۳) صدر ایوب کے خلاف نفرت کا جذبہ تو ہے لیکن یہ نفرت بغاوت کی شکل اختیار نہ کر سکے گی، کیونکہ صدر ایوب ابھی بہت مضبوط ہیں۔ میرا یہ اندازہ دو تین دن بعد ہی غلط ثابت ہو گیا۔

❀❀❀

شوپیان کے میر واعظ مولوی عبداللہ شاہ کے متعلق معلوم ہوا کہ لاہور میں رہتے ہیں لیکن ان کے گھر کا پتہ معلوم نہ تھا۔ کسی نے کہا دہلی مسلم ہوٹل کے سردار محمد عالم سے پوچھ لیجئے۔ انہیں سب کشمیریوں کا جغرافیہ معلوم ہے۔ یہ ہوٹل انارکلی میں واقع ہے اور اس کے مالک سردار محمد عالم پونچھ کے رہنے والے ہیں۔ ملک کی تقسیم سے قبل یہاں ہوٹل چلا رہے ہیں۔ ان کی تعلیم واجبی ہے لیکن سیاست سے ان کا بہت پرانا معاشقہ چل رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ ۱۹۴۷ء سے قبل جب شیخ صاحب، بخشی صاحب یا صادق صاحب لاہور آیا جایا کرتے تھے تو اس ہوٹل میں قیام کرتے تھے۔ سردار صاحب نے خاص طور پر شری شیام لعل کول کے بارے میں پوچھا، اور جب میں نے انہیں بتایا کہ وہ ایک حادثے میں جان بحق ہو گئے ہیں۔ تو انہیں بے حد افسوس ہوا۔ دہلی مسلم ہوٹل آج بھی لاہور میں اہل کشمیر کا ایک چھوٹا موٹا مرکز ہے۔ اور سردار محمد عالم صاحب بدستور سیاست میں دلچسپی لیتے رہتے ہیں۔ وہ چوہدری غلام عباس کے سرگرم حامیوں میں سے ہیں اور لاہور میں بیٹھ کر بھی آزاد کشمیر کی سیاست میں ٹانگ اڑائے ہوئے ہیں۔ سردار محمد عالم خان نے مجھے بتایا کہ پاکستانی حکمرانوں کا سلوک ہمارے ساتھ وہی رہا ہے جو ایک کالونی کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ چوہدری غلام عباس نے ہمیں عزت و توقیر دینا چاہی تو حکومت پاکستان نے خود ان کو عزت و توقیر سے محروم کر دیا۔ سردار صاحب سے میر واعظ صاحب شوپیان کا پتہ پوچھ کر ہم ریلوے روڈ کرشنا گلی میں ان کا مکان تلاش

کرنے لگے۔ معلوم ہوا کہ میر واعظ صاحب کرشنا گلی میں خاصے مشہور ہیں۔ ایک پرانی طرز کے مکان کی باہر والی ڈیوڑھی پر مولوی محمد عبداللہ شاہ میر واعظ کشمیر کی تختی لگی تھی۔ چچا رحیم نے آواز دی تو مولوی صاحب دوڑے دوڑے نیچے آئے۔

''انہیں پہچانتے ہیں آپ؟'' چچا رحیم نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

میر واعظ غور سے میری طرف دیکھنے لگے۔ کچھ دیر اپنے حافظے پر زور دینے کے بعد کہنے لگے کہ کچھ یاد نہیں آرہا ہے۔ میں نے یاد دلایا کہ مولوی محمد یعقوب کو جانتے ہیں۔ یہ سن کر میر واعظ مجھ سے لپٹ گئے ''تو تم شمیم ہو''!

میر واعظ صاحب کو والدِ مرحوم کی یاد دلا کر میں نے سب کچھ یاد دلایا تھا۔ فوراً اوپر لے گئے اور شوپیان کے بارے میں بیک وقت اتنے سوال کر ڈالے کہ میرے لیے جواب دینا مشکل ہو گیا۔ فلاں کہاں ہے؟ فلاں زندہ ہے یا مر گیا؟ اس کا کیاں حال ہے؟ وہ کیا کر رہا ہے؟ سکول کہاں پر واقع ہے؟ تھانے کی عمارت اب کہاں ہے؟ کیا یہ سچ ہے کہ اب ہیر پورہ تک گاڑی جاتی ہے؟ میر واعظ صاحب سوال پر سوال پوچھے جا رہے تھے اور میں حتی الامکان ان کی تسلی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر انہوں نے شوپیان میں میرے الیکشن کا موضوع چھیڑ دیا۔ معلوم ہوا کہ انہیں اس کے بارے میں کچھ کچھ معلوم ہے۔ کہنے لگے مجھے حیرت ہے کہ شوپیان والوں نے تمہارا ساتھ کس طرح دیا؟ اور پھر خود ہی کہنے لگے ''اس کے معنی یہ ہیں کہ کندہ ہائے ناتراش کو بھی عقل اور شعور آگیا ہے''۔ میر واعظ صاحب نے خاص طور پر شیخ غلام رسول کے بارے میں پوچھا، میں نے انہیں بتایا کہ وہ

اسمبلی کے ممبر رہ چکے ہیں اور آج کل کانگریس کے بلاک پریذیڈنٹ ہیں۔
اس پر میر واعظ صاحب نے ایک بڑے زور کا قہقہہ بلند کیا اور دو فارسی شعر پڑھے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ میں یہ دونوں شعر اپنی ڈائری میں درج کروں۔

پہلا شعر تھا:

گردشِ گرداں گردوں گرد ناں را گرد کرد
برسرِ اہل تمیزاں ناقصاں را مرد کرد

دوسرا شعر یہ تھا:

من نمی گویم کہ اے گردوں تو سرگرداں مکن
ہرچہ خواہی کن و لے محتاجِ نامرداں مکن

اس کے بعد میر واعظ صاحب نے اپنا احوال سنایا۔ میر واعظ صاحب کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ زمین و جائداد کے لحاظ سے آسودہ ہیں لیکن انہیں رہ رہ کر کشمیر یاد آرہا تھا۔ کہنے لگے کشمیر میں نہ زمین تھی، نہ جائداد مگر عزت تھی۔ یہاں بھی لوگ عزت کرتے ہیں لیکن وہی جو ایک مہاجر کی عزت ہوسکتی ہے۔
مولوی صاحب سے رخصت ہوکر ہم سیدھے گھر آئے اور میں میر واعظ کے بارے میں سوچنے لگا کہ کیا تھے اور کیا ہوگئے ہیں؟ دوسرے دن میں صبح کے وقت آزاد کشمیر کے سابق صدر کے۔ ایچ۔ خورشید سے ملنے گیا تو معلوم ہوا کہ وہ سیالکوٹ گئے ہیں۔ اس کے بعد میں اعجاز کو ساتھ لے کر شاعرِ مشرق اقبال کے مزار پر گیا۔ مزارِ اقبال شاہی مسجد کی سیڑھیوں تلے ایک مختصر سے خطۂ زمین پر تعمیر ہے اسکے بالکل سامنے لاہور کا قلعہ ہے۔ مغلوں کی شان وشوکت اور عظمت کی ان دو یادگاروں کے درمیان وہ مردِ درویش ابدی نیند سو رہا ہے، کہ

جس نے دنیا کو بانگِ درا، بال جبریل، ضربِ کلیم، جاوید نامہ، اسرار خودی و رموزِ بے خودی جیسی یادگاریں عطا کیں۔ شاہی مسجد اور شاہی قلعے کا جلال ایک عارضی چیز ہے۔ جو وقت کے بے رحم ہاتھوں سے ایک نہ ایک دن ضرور پامال ہوگا، لیکن قلعے کے سامنے شاہی مسجد کی سیڑھیوں تلے سویا ہوا اقبال رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔ یہ عظیم فن اور فنکار کا مقدر ہے۔

اقبال کے مزار پر اپنا سر جھکا کر مجھ پر رقت کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ میں اُردو کے ہی نہیں، اس صدی کے عظیم ترین شاعر کی بارگاہ میں تھا۔ میں ان لوگوں کی خوش بختی پر رشک کر رہا تھا کہ جنہیں اقبال کو دیکھنے، ان سے ملنے اور بات کرنے کا شرف حاصل رہا ہے اور پھر اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنے لگا کہ مجھے ان کے مزار پر حاضری دینے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ شاہی مسجد کی سیڑھیوں کے دائیں طرف پنجاب کے مشہور سیاست دان سر سکندر حیات خان کا مقبرہ بھی ہے۔ لیکن اکثر لوگ لوح تربت پر سر سکندر حیات کا نام پڑھ کر گذر جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اقبال کے مزار پر عقیدتمندوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ شاہی مسجد، دلی کی جامع مسجد کے طرز پر بنی ہوئی، لیکن اس کے مقابلے میں زیادہ صاف اور سجی ہوئی ہے۔ مسجد میں داخل ہوتے ہی دائیں طرف دوسری منزل پر تبرکات مقدسہ زیارت کے لیے رکھے ہوئے ہیں۔ ان تبرکات میں سے میں کچھ چیزیں اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھیں۔ مثلاً رسول پاک ﷺ سے منسوب ایک دستار، عصا اور ایک چپل ہے۔ اس کے علاوہ حضرت علیؓ اور حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کے قبا، اویسؓ کے دندان مبارک بھی زیارت کے لیے شیشے کے شوکیسوں میں سجے ہوئے ہیں۔ ایک شوکیس میں موئے مقدس رسول ﷺ اور قرآن پاک کے دو نسخے رکھے ہیں۔ قرآن پاک

کے ان دو نسخوں کے متعلق یہ روایت درج ہے کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں یہ دو نسخے ایک فوجی ٹرک میں رہ گئے تھے، اس ٹرک پر ہندوستانی فوجوں نے زبردست بمباری کی، لیکن اس کے باوجود یہ دو نسخے بالکل محفوظ حالت میں رہے، جب ٹرک ہندوستانی فوجوں کے قبضے میں آیا، تو انہوں نے یہ کہہ کر دونوں نسخے پاکستانی فوج کے سپرد کردئے کہ یہ خدا کی سچی کتاب ہے، ہم اس کی بے حرمتی نہیں کرسکتے۔ تبرکات مقدسہ کے دیدار کے لیے ہر روز ہزاروں لوگ یہاں آتے ہیں اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مجلس اوقاف لاہور نے زیارت کا بہت اچھا انتظام کیا ہے۔

شام کو لارنس باغ جواب باغِ جناح کے نام سے مشہور ہے، دیکھنے گئے۔ جناح باغ ہمارے ہاں کے نشاط باغ یا شالیمار باغ کی طرح خوبصورت یا رنگین نہیں، اس کی خوبصورتی اس میں ہے کہ یہ لاہور کے بالکل وسط میں ہے اور بہت بڑا ہے۔ شام کو اکثر اہالیانِ لاہور یہاں سیر کے لیے آتے ہیں۔ باغ کے بالکل بیچ میں ایک باغیچے کو خاص طور پر Develop کیا گیا ہے اور اس کا نام گلستانِ فاطمہ رکھا گیا ہے۔

رات کو کچھ دوستوں کے ہمراہ شہر کے سب سے عظیم الشان ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں حسینانِ لاہور کی سج دھج اور آن بان کو ذرا قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ لباس، تزئین اور آرائش جمال میں پاکستانی خواتین بہت آگے نکل چکی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ابھی برقعے کا خاصا رواج ہے لیکن جہاں جہاں برقعہ اٹھ گیا ہے، وہاں مشرق اور مغرب کے درمیان کوئی حدِ فاصل نظر نہیں آتی۔ اسی رات انٹر کانٹی نینٹل میں ایک نو بیاہتا جوڑے کے اعزاز میں استقبالیہ میں دعوت دی جارہی تھی، جہاں شہر کے اعلیٰ طبقے کے لوگ

مدعو تھے۔ جدید ترین لباس میں ملبوس پاکستانی حسیناؤں کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ پاکستان میں ملاؤں کا زور ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ رنگ و نور کا سیلاب اُمڈا چلا جا رہا ہے۔ میرے ساتھیوں میں کچھ فوجی افسر بھی تھے۔ بات چیت کا سلسلہ چل پڑا تو ۱۹۶۵ء کی جنگ کا ذکر بھی چھڑ گیا اور میرے دوستوں نے بلا تکلف اس جنگ میں پاکستانی افواج کی بہادری کے قصے سنانے شروع کیے۔ لاہور کی مدافعت، پاکستانی ہوابازوں کی جوانمردی، پاکستانی عوام کا ایثار، ان موضوعات، پر بات کرتے ہوئے ہر پاکستانی جذباتی ہو جاتا ہے۔ اُسے اس بات کا یقین دلایا گیا ہے کہ اس جنگ میں پاکستان جیت گیا ہے۔ اور ہندوستان کو ہر محاذ پر شکست نصیب ہوگئی ہے۔ اپنے چالیس روزہ قیام کے دوران میری ملاقات صرف دو ایسے آدمیوں سے ہوئی جنہوں نے بڑی بے خوفی کے ساتھ اس بات کا اعتراف کیا کہ پاکستان اس جنگ میں بری طرح ناکام رہ گیا اور اسے سیاسی اور فوجی محاذ دونوں پر ہی شکست ہوئی۔ ان میں سے ایک کا نام ذوالفقار علی بھٹو ہے اور دوسرے کا نام ظاہر کرنا مصلحت نہیں ہوگی۔ کوئی پاکستانی اس بات پر یقین کرنے کے لیے تیار ہی نہیں کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران ہندوستانی فوج اور عوام نے بھی جوانمردی، جرات، ایثار اور اتحاد کا وہی مظاہرہ کیا ہے، جو پاکستانی صرف اپنے لیے مخصوص رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے جب اپنے دوستوں کو بتایا کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران ہندوستان جتنا متحد اور منظّم تھا، اس سے پہلے کبھی نہ تھا، تو وہ ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھنے لگے کہ جیسے کہہ رہے ہوں کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کی بات کا یقین نہ کرنا۔

کچھ دیر بعد موضوع بدل گیا اور ہندوستان کے جمہوری نظام کی بات چھڑ

گئی۔ ایک فوجی افسر نے پوچھا کہ کیا ہندوستان میں واقعی جمہوریت ہے؟ میں نے کہا جی ہاں کیوں نہیں؟

یہ بتائیے کہ ڈاکٹر کرن سنگھ ایمانداری سے انتخاب جیتے یا بے ایمانی سے؟ فوجی افسر نے پوچھا، ان کے اس سوال پر مجھے قدرے حیرانگی ہوئی کہ انہوں نے خاص طور پر ڈاکٹر کرن سنگھ کا نام کیوں لیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ڈیرہ ڈون میں ڈاکٹر کرن سنگھ کے ہم عصر رہے ہیں۔

عام پاکستانیوں کے لیے یہ یقین کرنا بھی مشکل ہے کہ ہندوستان میں ہر پانچ سال کے بعد آزادانہ طور انتخاب ہوتے ہیں۔ صدر ایوب کی بنیادی جمہورتیوں نے جمہوریت پر ان کا رہا سہا اعتقاد بھی ختم کر دیا ہے۔ اس لیے اکثر پاکستانی مجھ سے یہ سوال کرتے کہ کیا ہندوستان میں واقعی آزادانہ انتخاب ہوتے ہیں؟ لیکن ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں، جو کھل کر ہندوستانی نظام جمہوریت کی تعریف کر کے پاکستانی بنیادی جمہوریتوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ پاکستان میں آمریت کے خلاف بغاوت کے کئی اسباب ہیں، لیکن ہندوستان میں جمہوری نظام کی کامیابی بھی پاکستان میں موجوہ انقلاب کا ایک اہم سبب ہے۔ ہندوستان کے تئیں بے پناہ نفرت اور بیزاری کے باوجود بہت سے پاکستانی دانشور ہندوستان کے جمہوری نظام پر رشک کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو لوگ کبھی کبھی جمہوری نظام کی خامیوں اور کمزوریوں سے دل برداشتہ ہو کر مایوسی کا اظہار کرنے لگتے ہیں، پاکستان کے حالیہ انقلاب میں ان کے لیے اُمید اور اعتقاد کا بہت بڑا اسبق ہے۔ اس انقلاب نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ جمہوریت میں لاکھ برائیاں ہوں، اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ یہ موجودہ دور کے تمام سیاسی نظاموں میں سب سے بہتر اور دیرپا ہے اور

آمریت سے بہر حال لاکھ درجہ بہتر ہے۔اس کا احساس صرف ان پاکستانیوں کو ہے جنہوں نے جمہوریت کو کھو کر آمریت کا مزا چکھا ہے۔

۲۱ر جنوری کو میں راولپنڈی کے لیے روانہ ہوگیا۔لیکن راولپنڈی روانہ ہونے سے قبل میں آپ کو یہ بتاؤں کہ لاہور کا شہر مجھے بے حد پسند آیا۔اس شہر کو پاکستان کے ادبی اور تہذیبی مرکز کی حیثیت حاصل ہے اور یہاں صرف چار پانچ دن گذار کر ہی مجھے اس بات کا حساس ہوگیا کہ اس شہر کی اپنی ایک شخصیت اور کردار ہے۔ مال روڈ کے متعلق میں نے بہت سے افسانے سنے تھے۔ تقسیم سے قبل جو لوگ لاہور آیا کرتے تھے، وہ اکثر لاہور کی مال روڈ کا یوں ذکر کیا کرتے کہ جیسے کسی بچھڑے ہوئے محبوب کا ذکر کرتے ہیں۔ مال روڈ کا نام اب شاہراہِ قائد اعظم ہے۔لیکن یہ سرکاری نام ہے لوگ اب بھی اسے مال روڈ ہی کے نام سے پکارتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ تقسیم کے بعد سے مال روڈ کافی بدل گئی ہے لیکن اسے اب بھی لاہور کی تہذیبی اور سماجی زندگی کی ایک اہم علامت سمجھا جاتا ہے۔پاکستان کی جس ایک ادا پر میں بالکل ہی مرمٹا وہ ہے اردو کا چلن۔ پاکستان بننے سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ ہوا ہے یا نہیں۔ یہ مسئلہ خود پاکستان میں بھی مابہ نزاع ہے، لیکن پاکستان نے اردو کو بچالیا، یہ بڑی بات ہے۔اردو صحافت نے پاکستان میں جو عظیم الشان ترقی کی ہے۔ ہندوستان میں رہتے ہوئے اس کا صحیح اندازہ کرنا ممکن نہیں۔اردو کے درجنوں روزانہ اخبارات لاہور، راولپنڈی اور کراچی سے شائع ہوتے ہیں اور اس سج دھج سے شائع ہوتے ہیں کہ اپنے ہاں کے انگریزی اخبار بھی ان کے مقابلے میں ہیچ نظر آتے ہیں۔روزنامہ ''جنگ'' کراچی اور راولپنڈی سے بیک وقت شائع ہوتا ہے اور اس کی کل اشاعت دولاکھ سے زیادہ ہے۔''مشرق''، کراچی

اور لاہور سے ایک ساتھ شائع ہوتا ہے اور اتنا خوبصورت اور دیدہ زیب ہوتا ہے کہ طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ اسی طرح امروز، نوائے وقت، کوہستان، تعمیر بیک وقت لاہور اور راولپنڈی سے شائع ہوتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق نوائے وقت (جو حزب مخالف کا اخبار ہے) کی اشاعت حالیہ ایجی ٹیشن کے دوران ساڑھے تین لاکھ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ احمد ندیم قاسمی اور ابراہیم جلیس جیسے ادیب اخباروں سے وابستہ ہیں اور بقول ایک پاکستانی ادیب کے، پاکستان میں اردو کا کوئی ادیب اب بھوکوں نہیں مر سکتا۔ یہی حال رسائل و جرائد کا ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ میں لاہور کی مال روڈ پر ہر شام فیروز اینڈ سنز کی دکان پر کتابوں اور رسالوں کی ورق گردانی کرتا رہتا۔ جی چاہتا کہ ساری دکان کو سمیٹ کر لیتا جاؤں مگر پھر حسینی والا کے پہریداروں کا خیال آ جاتا اور میں اپنی آنکھوں کی پیاس بجھانے پر ہی قناعت کرتا۔

لاہور سے جس ریل گاڑی میں، میں پنڈی جا رہا تھا۔ اس کا نام تھا تیز گام، کم بختوں نے ریلوں کے بھی ایسے ایسے نام رکھے ہیں کہ بقول شاعر ؎

پسلی پھڑک گئی نگہ انتخاب کی

ایک ریل کا نام ہے تیز رو، دوسری کا سُبک رفتار اور تیسری کا تیز گام۔ اے کاش! اپنے ہاں بھی ریلوں کے اتنے ہی خوبصورت نام رکھے جاتے۔ مگر جو لوگ ریلوے سٹیشن کو دھک دھک منڈل کے نام سے پکاریں، وہ ناموں کے حسن اور ان کی معنویت کا کیا سمجھیں گے۔

❁❁❁

۲۱ر جنوری کو صبح ساڑھے دس بجے لاہور سے چل کر میں دن کے ڈیڑھ بجے راولپنڈی پہنچا۔ ایک دن قبل میں نے صابر صاحب کو تار دیدیا تھا کہ میں آ رہا ہوں اور مجھے یقین تھا کہ وہ میرے استقبال کے لیے سٹیشن پر موجود ہوں گے، لیکن میں یہ سوچ رہا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو پہچان سکیں گے یا نہیں۔ بیس برس پرانی بات تھی یہ، میرے ذہن میں صابر صاحب کا ایک دھندلا سا عکس تھا، اور مجھے اس بات کا یقین نہ تھا، کہ اگر ہم بے خبری میں ایک دوسرے کو دیکھ لیں، تو پہچان سکیں گے، گاڑی راولپنڈی کے سٹیشن پر رک گئی، تو میں دروازے پر آ کھڑا ہو گیا، کہ کہیں کوئی جانا پہچانا چہرہ نظر آئے، یکا یک میں نے کچھ لوگوں کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا اور دیکھتے ہی مولوی عبد الغفار آ کر مجھ سے لپٹ گئے اور پوچھنے لگے کہ مجھے پہچانتے ہو؟ میں نے اپنے حافظے پر زور دے کر کہا کہ آپ غالباً مولوی عبد الغفار ہیں۔ مولوی صاحب نے ایک زوردار قہقہہ مار کر مجھے شاباش دی۔ اس کے بعد میرے آبائی گاؤں ناسنور کے خواجہ محمد عبد اللہ صاحب بغل گیر ہو گئے لیکن استقبال کرنے والوں میں بہت سے چہرے اجنبی اور نامانوس لگ رہے تھے۔ مولوی عبد الغفار صاحب نے ایک ایک کر کے ان کا تعارف کرایا، یہ سب مقامی صحافی تھے۔ ''انصاف'' کے مدیر میر عبد العزیز، ''کشیر'' کے عبد الصمد وانی ''پنڈی بل'' کے ایڈیٹر اور کچھ دوسرے دوست مگر میری نگاہیں تو چچا صابر کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ معاً ایک سفید ریش بزرگ نے آگے بڑھ کر مجھے سینے سے لگایا اور زار و قطار رونا شروع کیا۔ ان کی آنکھوں سے بے تحاشا بہتے ہوئے آنسوں نے ان کا

تعارف کرایا کہ یہ ایم۔اے صابر تھے۔

پورے پانچ منٹ تک وہ مجھے گلے لگا کر اس طرح روتے رہے کہ مجھ سے بھی رہا نہ گیا اور میری آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ بیس سال کی جدائی کے بعد اس غیر متوقع ملاپ نے نہ معلوم ان کی کتنی حسرتوں کو بیدار کیا تھا، وہ میری طرف یوں گھور گھور کر دیکھ رہے تھے کہ جیسے انہیں یقین نہ آرہا ہو کہ میں شمیم ہوں۔ بار بار عبدالغفار صاحب سے پوچھتے کہ یہ خواب ہے یا حقیقت، یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ سٹیشن سے باہر آئے تو معلوم ہوا کہ ٹانگہ، ٹیکسی، کوئی سواری شہر کی جانب چلنے کے لیے تیار نہیں، کیونکہ آج پنڈی میں طلباء کی طرف سے زبردست مظاہرے ہورہے ہیں اور پورے شہر کا کاروبار معطل ہے۔ جوں توں کر کے ایک ٹیکسی والے کو ایک دور و دراز راستے سے سیٹلائٹ ٹاؤن چلنے پر راضی کرلیا۔ پُر پیچ گلیوں میں سے ہوتے ہوئے بالآخر ہم گھر پہنچ ہی گئے۔ گھر میں چچی جان صبح سے میرا انتظار کرتے کرتے تھک گئیں تھیں۔ مجھے دیکھ کر ان کے بیمار چہرے پر وہ رونق ابھر آئی کہ جیسے بیس سال کی ساری کوفتیں مسرت کے سیلاب میں ڈوب گئی ہوں۔ وہ مجھ سے مل کر بہت دیر تک آنسو بہاتی رہیں اور میں یہ سوچنے لگا کہ میری آمد نے کتنے زخموں کو ایک بار پھر ہرا کر دیا ہے۔ صابر صاحب سیاستدان تھے، اخبار نویس تھے، اور کیا کچھ نہیں تھے۔ انہیں غریب الوطنی کی سزا مل گئی ہے تو بات سمجھ میں آسکتی ہے، لیکن بچاری چچی جان تو سیاست کے ابجد سے بھی واقف نہیں، انہیں اپنے وطن سے بے وطن ہونے کی سزا کیوں بھگتنا پڑ رہی ہے؟ اور میری چچی جان ہی کی طرح کتنی مائیں اپنے بیٹوں اور بیٹیوں سے صرف اس لیے بچھڑ گئی ہیں کہ سیاستدانوں نے دو ملکوں کے درمیان نفرت اور عداوت کی ناقابل عبور

دیواریں کھڑی کردی ہیں۔

سیٹلا ئٹ ٹاؤن ایک نئی بستی ہے جو پاکستان بننے کے بعد آباد ہوئی ہے۔ یہ تقریباً دو میل تک پھیلی ہوئی ہے۔ اور اس میں زیادہ تر مہاجر آباد ہیں جو ہندوستان سے اجڑ کر یہاں آئے۔ صابر صاحب کا اصلی مکان ایبٹ آباد میں ہے اور وہ یہاں کرائے کے مکان میں رہ رہے ہیں۔ سرما میں ایبٹ آباد میں چونکہ بہت زیادہ سردی پڑتی ہے۔ اسلیے کچھ لوگ سردیاں گزارنے کے لیے پنڈی آجاتے ہیں۔ کھانا کھا کر ہم لوگ فارغ ہو ہی گئے تھے کہ اکرام اللہ جسوال اور کچھ اور ساتھی آگئے۔ جسوال صاحب محاذ رائے شماری کے اس گروپ کے ایک لیڈر ہیں، جو ''لامحدود'' رائے شماری کے حق میں ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ رائے شماری کے وقت ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ خود مختار کشمیر کا (alternative) بھی چاہتے ہیں۔ جسوال صاحب نے آنے کے ساتھ ہی میر عبدالعزیز گروپ سے اپنے اختلافات کی وضاحت کردی اور مجھے اندازہ ہوا کہ غریب الوطنی میں بھی برادران وطن جماعتوں اور گروپوں میں بٹ کر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں۔ کچھ دیر بعد صابر صاحب مجھے سیٹلا ئٹ ٹاؤن کی سیر کے لیے لے گئے، کہنے لگے کہ ''گھر میں بیٹھے رہو گے تو یہ سیاستدان تمہیں چین نہ دیں گے، ان بیوقوفوں کے خیال میں دنیا کی ساری سیاست ان کے گرد گھومتی ہے۔ چلو باہر چلیں''۔ چچا جان کی عمر ستر اکہتر برس کے قریب ہوگی، لیکن ان کی صحت چچا رحیم اور چچا بشیر دونوں کے مقابلے میں بہتر ہے۔ چند سالوں سے انہوں نے داڑھی رکھ لی ہے اور سفید داڑھی میں وہ بالکل میرے دادا مولوی عبداللہ وکیل سے ملتے جلتے ہیں۔ وہ ملک کی تقسیم سے قبل سرینگر سے ''البرق'' نام کا ایک ہفت روزہ نکالتے تھے اور ان کار

شمار یہاں کے اُن صحافیوں میں ہوتا تھا کہ جن کے نام سے ظالم اور بددیانت افسر کانپ جاتے تھے، ان کی باقاعدہ تعلیم صرف انٹرنس تک ہے، لیکن انکے قلم اور زبان میں وہ جادو تھا کہ بڑے بڑے ڈگری یافتہ انہیں اپنا استاد مانتے تھے۔ سیٹلائیٹ ٹاون کی سیر کراتے کراتے صابر صاحب مجھے پاکستان میں اپنی جدوجہد کی کہانی سنانے لگے، کہنے لگے "میں ان بدقسمت اور بدنصیب کشمیریوں میں سے ایک ہوں کہ جن کو پاکستانی حکومت نے ان کی مرضی کے خلاف قیدیوں کے تبادلے میں یہاں بلالیا۔ کشمیر سے روانہ ہوتے وقت مجھے اپنے بیوی بچوں سے بھی ملنے نہیں دیا گیا، اور سیدھا سوچیت گڑھ پہنچا دیا گیا بعد میں معلوم ہوا کہ سیف الدین گنائی (سابق ڈی، آئی، جی پولیس) نے میرے گھر والوں کو اطلاع کر دی تھی کہ مجھے پاکستان بھیجا جا رہا ہے اور اسکے ساتھ ہی انہیں اخراجات کے لیے سو یا دوسو روپے دئے تھے۔ میری طرف سے سیف الدین صاحب کا شکریہ ادا کرنا، میں آج بیس سال بعد بھی ان کی مروت اور شفقت کو نہیں بھولا ہوں! پاکستان میں نہ ہمارے رہنے کے لیے کوئی جگہ تھی اور نہ روزگار کی کوئی صورت اور ان حالات میں ہم نے اپنی زندگی کا سفر شروع کر دیا۔ اور اس سفر پر مجھ پر کیا بیتی، یہ ایک روح فرسا داستان ہے۔ میری مجبوری کا اندازہ تم اس سے کر سکتے ہو کہ میں نے ایک وقت سرکاری ملازمت کی ذلت بھی برداشت کی۔ میں مظفرآباد میں ریفیوجی کیمپ کا کمانڈر رہا اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میرے کیمپ میں جو غیر مسلم میرے سپرد تھے، میں نے اپنے بچوں کی طرح ان کی دیکھ بھال کی۔ صابر صاحب اپنی داستان سناتے سناتے بہت جذباتی ہو گئے اور یک لخت انہیں اپنا ماضی یاد آگیا۔ تم نہیں جانتے کہ میں کیا تھا، تم ان دنوں بہت چھوٹے تھے لیکن تم جاکر

کسی سے پوچھ لو، وہ تمہیں بتائے گا کہ ایم، اے صابر کون تھا؟ میرے اخبار البرق کی وہ دھوم مچی ہوئی تھی کہ بڑے بڑے وزیر میرے نام سے کانپتے تھے۔ اس میں، میں ایک کالم لکھا کرتا تھا ''اندھیر نگری کے بازار میں ایم، اے صابر کی سیر'' اس کالم میں ہر ہفتے کسی نہ کسی سرکاری دفتر یا افسر کا حلیہ پیش کر کے اس کے بخیئے ادھیڑ کے رکھ دیتا۔ البرق واقعی البرق تھا۔ یہ میرے روزگار اور عزت دونوں کا ذریعہ تھا۔ یہاں آ کر میں نے کئی سال اخبار نکالنے کی کوشش کی، لیکن آج تک اخبار نکالنے کی اجازت نہیں ملی ہے۔ اب تمہارا اخبار پڑھتا ہوں، تو یہ تسلی ہو جاتی ہے کہ وہاں بیٹھ کر تم نے البرق کی روش کو نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ اسے اور زیادہ بہتر بنا دیا ہے''۔ باتیں کرتے کرتے ہم علامہ کشفی کے گھر پہنچ گئے۔ یہ وہی علامہ کشفی ہیں جو سرینگر کے اخبار ''خدمت'' میں ''کشفیات'' لکھا کرتے تھے۔ اب آزاد کشمیر ریڈیو میں ملازم ہیں۔ صابر صاحب نے کشفی صاحب سے میرا تعارف کرایا تو کشفی صاحب اُچھل پڑے۔ معلوم ہوا کہ ''آئینہ'' کی معرفت وہ مجھے بہت پہلے سے جانتے ہیں۔ محبت اور شفقت سے کہنے لگے کہ ''بیٹا تم نے اردو صحافت کی لاج رکھ لی ہے۔ تمہارا اخبار پڑھ کر کشمیر کے روشن مستقبل کا یقین ہو جاتا ہے''۔ اس کے بعد کچھ دیر تک کشمیر کی، کشمیر کی صحافت اور سیاست کی باتیں ہوتی رہیں، کشفی صاحب کی باتوں سے ایسا لگ رہا تھا کہ ان کے دل پر کوئی گہری چوٹ لگی ہے۔ گفتگو کے دوران کئی بار ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ دوبارہ ملاقات کا وعدہ کر کے ہم رخصت ہو گئے۔ قریب ہی مولوی عبدالغفار کا مکان تھا، صابر صاحب نے کہا کہ دو چار دن میں ان کی لڑکی کی شادی ہونے والی ہے، وہاں بھی ہو آئیں۔ مولوی عبدالغفار صاحب میرے آبائی گاؤں ناسنور کے رہنے

والے ہیں۔ تقسیم سے قبل سرینگر سے ''اصلاح'' نام کا اخبار نکالتے تھے، جو قادیانی احمدیوں کا آفیشل آرگن سمجھا جاتا تھا۔ یہاں آکر انہوں نے اپنا نام منور کاشمیری رکھ لیا ہے۔ کچھ دیر آزاد کشمیر ریڈیو میں بھی ملازم رہے۔ پھر کچھ تجارت شروع کر دی اور اسکے ساتھ ساتھ سیاست بھی۔ ان ہی دنوں مولوی صاحب نے ترکِ سیاست کا اعلان کیا تھا۔ اس کی وجوہات بیان کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہمارے یہاں کی سیاست میں بہت خباثت داخل ہوگئی ہے اور جو لوگ سیاست کرنا چاہتے ہیں وہ اس خباثت سے دامن نہیں بچا سکتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کو راولپنڈی میں بیٹھ کر آزاد کشمیر کی سیاست میں دخل در معقولات دینا پڑتا ہے۔ جن لوگوں نے سیاست کو پیشہ بنایا ہے، انہیں اس قسم کی سیاست بہت مرغوب ہے، لیکن مجھے ذاتی طور پر اس قسم کی سیاست سے نفرت ہوگئی ہے اور اسی لیے میں نے سیاست سے علیحدگی اختیار کی ہے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے میر عبدالعزیز ایڈیٹر ''انصاف'' کی بھی شکایت کی، کہ یہ آدمی کسی کے سر پر پگڑی نہیں دیکھ سکتا اور اگر اسے کسی کے سر پر پگڑی نظر آئے تو اسے اچھالے بغیر اس کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ میر عبدالعزیز کے متعلق اکثر کشمیریوں کی یہی رائے ہے۔ بہر کیف مولوی عبدالغفار اور ان کے بیوی بچوں سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ دو چار دن بعد ان کی صاحبزادی کی شادی ہونے والی تھی اور اس موقعہ پر بہت سے جان پہچان کے لوگوں سے ملاقات ہونے کا امکان تھا۔

دوسرے دن علی الصبح اخبارات دیکھے تو معلوم ہوا کہ کل شہر میں زبردست گڑبڑ تھی۔ طلباء اور پولیس کے درمیان کئی بار زبردست تصادم ہوئے ہیں۔ کئی بار گولی چلی ہے اور بہت سی سرکاری بسوں کو آگ لگادی گئی ہے۔ اخباری اطلاعات

کے مطابق شہر کی پولیس نے اندادھند گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کردیا تھا اور پولیس کمشنر نے احکامات جاری کردئے تھے کہ جن مکانوں کی چھتوں سے پولیس پر پتھراؤ ہوگا، پولیس اس گھر کے سبھی لوگوں کو گرفتار کرنے کی مجاز ہوگی۔ ادھر لاہور کی حالت بھی بہت خراب تھی اور وہاں سے دو طالب علم پولیس کی فائرنگ سے ہلاک ہوگئے تھے۔ وہاں ۷۲ گھنٹوں کا کرفیو لگا دیا گیا تھا۔ اس شام مغربی پاکستان کے گورنر محمد موسیٰ خان نے ریڈیو سے جو تقریر کی، اُس سے معلوم ہورہا تھا کہ صدر ایوب اور ان کے ساتھیوں کو ابھی آنے والے طوفان کی شدت کا اندازہ نہیں تھا۔

صبح دس بجے کے قریب چچا صابر اور میں میر عبدالعزیز ایڈیٹر ''انصاف'' کے ہاں (بنی) گئے۔ میر صاحب ریاست کی سیاست اور صحافت کے پرانے کھلاڑی ہیں۔ یہ وہی میر صاحب ہیں جو پنڈت پریم ناتھ بزاز کے اخبار ''ہمدرد'' میں نمک پاشی اور مرچ پاشی کے نام سے مزاحیہ نظمیں لکھا کرتے تھے۔ مسلم کانفرنس کے سرگرم کارکن اور بزاز صاحب کے بڑے معتقد! یہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کی بات ہے۔ پاکستان میں آنے کے بعد حکومت پاکستان سے کئی بار ٹکرائے۔ دو مرتبہ جیل کی ہوا بھی کھانا پڑی۔ آزاد اور خود مختار کشمیر کے سرگرم حامیوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ لیکن اب کچھ دنوں سے انداز بدل گیا ہے۔ محاذ رائے شماری کے انتہا پسند گروپ سے اختلاف کی بنا پر ایک الگ محاذ بنا ڈالا۔ پاکستان میں یہ ''محدود رائے شماری'' والے محاذ کے نام سے مشہور ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ کشمیر میں سلامتی کونسل کے ریزولیوشنوں کی روشنی میں رائے شماری ہونا چاہیے اور فی الحال آزاد کشمیر کے alternative پر زور دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میر صاحب بڑے زندہ دل، حاضر جواب، بذلہ سنج اور لطیفہ گو آدمی ہیں۔ انہیں زبان اور قلم دونوں پر قدرت حاصل ہے لیکن ان کے متعلق عام شکایت یہ ہے کہ مخالف کا مقابلہ کرتے ہوئے یہ

کبھی کبھار نہیں، اکثر سطح سے گر جاتے ہیں۔ پورے پاکستان میں ایک بھی کشمیری ایسا نہ ہوگا جو ان کے قلم اور زبان کی زد سے محفوظ رہا ہو۔ میر صاحب بے حد ذہین اور فطین آدمی ہیں۔ پاکستان ہی نہیں عالمی سیاست پر ان کی گہری نظر ہے۔ وہ بنیادی طور پر عقلیت پسند ہیں۔ لیکن اپنے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔ اس لیے ان کی سیاست میں جذبات کے ساتھ ساتھ مصلحت بھی شامل ہوگئی ہے۔

میر صاحب کے دفتر میں بیٹھے بیٹھے میں نے صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان اور وزیر خارجہ ارشد حسین ۔کے نام دو عدد خط لکھ دئے کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ یہاں سے فارغ ہوکر ہم عدالت کی طرف گئے۔ جہاں سوپور کے ثناء اللہ شمیم صاحب اور بارہمولہ کے غلام الدین وانی سے ملاقات ہوئی۔ شمیم صاحب اور وانی صاحب دونوں ہی اس وقت وکالت کرر ہے ہیں۔ لیکن سیاست سے ان کا رشتہ ابھی تک قائم ہے۔ دونوں ہی صاحبان ''آزاد کشمیر'' میں وزیر رہ چکے ہیں۔ اب راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ شمیم صاحب اور وانی صاحب ''آئینہ'' کی وساطت سے مجھ سے متعارف تو تھے، لیکن پہلی ملاقات میں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے کسی حد تک خائف ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا سبب میرے سیاسی معتقدات ہیں، میری ذات نہیں، بعد کی ملاقاتوں میں دونوں ہی خاصے بے تکلف ہوگئے اور ان کے نام سے کچھ یادگار صحبتیں وابستہ ہوگئیں۔ شمیم صاحب سے دریافت کیا کہ مظفر آباد جانے کا اجازت نامہ کہاں سے حاصل ہوسکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ مظفر آباد جانے کا پرمٹ منسٹری آف کشمیر افیئرس سے ملتا ہے، سو ہم اسلام آباد کے لیے روانہ ہوگئے۔

❁❁❁

اسلام آباد راولپنڈی سے ۵ میل دور جدید ترین طرز پر تعمیر کیا ہوا ایک نہایت ہی خوبصورت شہر ہے۔ یہ راولپنڈی سے کوہ مری جانے والے راستے پر ایک پہاڑی کے دامن میں واقع ہے اور جدید فنِ تعمیر کا ایک ایسا نمونہ ہے کہ صرف اس شہر کی تعمیر کے کے لیے صدر ایوب کی ہر خطا معاف کی جاسکتی ہے۔ اس شہر کی تعمیر کا کام ۱۹۶۰ء میں شروع ہوا تھا اور آٹھ سال کے قلیل عرصے میں اتنا بڑا، اتنا خوبصورت اور اتنا دلربا شہر تعمیر کرنے والے یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اسلام آباد کی چوڑی، چکلی، صاف و شفاف اور ہموار سڑکوں سے گذرتے ہوئے جب میں ایک ایسے مرکزی نقطے پر پہنچ گیا. جہاں سے پورے شہر پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جاسکتی تھی، تو میرے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ اتنا وسیع شہر صرف چھ سات سال کے اندر اندر تعمیر ہو سکتا ہے۔ عظیم الشان سرکاری عمارات، جدید ترین مارکیٹ، ملازمین کے لیے چار سو بکھری ہوئی اقامت گاہیں، غیر ملکی سفارت خانوں کا جاہ وجلال، جدید سے جدید طرز پر تعمیر کی گئی کوٹھیاں اور پھر سیکر یٹریٹ کی پر شکوہ اور فلک بوس عمارتیں، معلوم ہوتا ہے کہ کسی مصور کے خواب کو حقیقت کا درجہ مل گیا ہے۔ یہ شہر ایک ڈھلان پر واقع ہے اور اس میں بہت دور دور تک پھیلنے کی بڑی گنجائش موجود ہے۔ حکومت کی طرف سے عام شہریوں کو یہاں مکان تعمیر کرنے کی ہر ممکن سہولیت دی جاتی ہے اور اسی لیے دھڑا دھڑ عالیشان کوٹھیاں تعمیر ہو رہی ہیں۔ سرکاری ملازمین کو اپنے مکانات تعمیر کرنے کے لیے خصوصی رعایات دی جاتی ہیں اور

اس طرح پاکستان کے نئے دارالخلافے کو اب وہ مرکزی اہمیت حاصل ہو رہی ہے جو اس سے پہلے کراچی کو حاصل تھی۔ تمام غیر ملکی سفارت خانوں نے اپنے اپنے دفتر یہاں منتقل کر دئے ہیں اور ان سفارت خانوں پر مختلف ممالک کے جھنڈے فضا میں لہراتے ہوئے اسلام آباد کی مرکزیت کا اعلان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سرکاری ملازمین کے لیے رہائش گاہیں تعمیر کرنے کی طرف خاص توجہ دی گئی ہے اور چھوٹے ملازمین کے رہائشی کوارٹر دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہوئی کہ ان میں تقریباً سبھی بنیادی ضروریات پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پاکستان میں سوئی گیس کی دریافت نے ایک عظیم انقلاب بپا کر دیا ہے اور اسلام آباد کے ہر گھر میں سات روپے اور چودہ روپے ماہوار کے حساب سے سوئی گیس بہم ہے۔ آپ جتنا گیس استعمال کرنا چاہیں، کر لیجئے۔ آپ کی فیس سات روپے فی چولھا سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اسلام آباد کے علاوہ پاکستان کے کئی اور شہروں میں بھی سوئی گیس کی بہم رسائی کی سہولیات مہیا کی گئی ہیں اور اس طرح خانہ داری کی ایک اہم مشکل بہت حد تک حل ہو گئی ہے۔

مظفر آباد جانے کے لیے ہر غیر پاکستانی کو وزارت امور کشمیر سے ایک خاص اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا ہے اور اس مقصد کے لیے مجھے بھی منسٹری میں جانا پڑا۔ وزارت امور کشمیر کا دفتر اسلام آباد کے ایک سرے پر واقع ہے۔ ناسنور کے میجر مبارک احمد ڈار کے ہمراہ میں وزارتِ امور کشمیر کے متعلقہ افسر مسٹر ممتاز سے ملا اور انہیں مظفر آباد کے لیے اجازت نامے کی درخواست کی۔ مسٹر ممتاز بڑی خندہ پیشانی سے ملے، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ انہیں میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ کچھ دیر کے لیے بڑی بے تکلفی سے باتیں

ہوتی رہیں اور پھر ممتاز صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ کل یا پرسوں آکر ''آزاد کشمیر'' کا پرمٹ لیجایئے۔ ممتاز صاحب سے رخصت ہوکر میں باہر آیا، تو مجھے محسوس ہوا کہ وزارت امورِ کشمیر پاکستان میں میرے وجود سے غافل نہیں ہے۔ کچھ دن بعد جب میں نے کراچی اور ڈھاکہ جانے کے لیے ویزا کی درخواست دی، تو میرے اس احساس کو مزید تقویت ملی، بہرکیف اسلام آباد سے لوٹتے ہوئے میرے دل ودماغ پر ایک ہی تاثر چھایا ہوا تھا اور وہ یہ تھا کہ اسلام آباد بہت ہی خوبصورت شہر ہے۔

اسلام آباد سے راولپنڈی آتے ہوئے سڑک کے بائیں طرف چوہدری غلام عباس خان کی قبر ہے۔ میں نے چوہدری صاحب کو کبھی نہیں دیکھا ہے لیکن ان کے بارے میں سنا ہے کہ بڑے مخلص اور دیانت دار رہنما تھے۔ اس اجنبی دیار میں چوہدری صاحب کی قبر دیکھ کر مجھے وہ بہت سے بدنصیب یاد آگئے جن کو اپنے وطن کی مٹی بھی نصیب نہ ہوسکی۔ مرحوم کی قبر پر ان کے عقید تمندوں نے ایک مقبرہ تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ لوحِ تربت کے اردگرد پھولوں کے ہار سجے ہوئے تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ چودھری صاحب وفات نہیں پاگئے ہیں۔ کہیں گئے ہوئے ہیں اور جلد ہی لوٹنے والے ہیں۔ میں نے فاتحہ پڑھی اور باوجود اس کے کہ میں نے چوہدری صاحب کو کبھی نہیں دیکھا ہے، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں انہیں برسوں سے جانتا ہوں۔ وہاں سے روانہ ہوتے وقت مجھے بے اختیار اختر شیرانی کا یہ گیت یاد آیا ۔

او دیس سے آنے والے بتا
کس حال میں ہیں یارانِ وطن!

یہ غالباً چوہدری مرحوم کی روح کی آواز تھی۔

راولپنڈی میں طلبا نے اپنی سرگرمیاں تیز تر کردی تھیں۔ میں اسلام آباد سے راولپنڈی کی طرف جارہا تھا، کہ راستے میں کئی ہزار طلباء اور طالبات کا ایک جلوس لیاقت باغ کی طرف بڑھتے دیکھا۔ لیاقت باغ وہ جگہ ہے، جہاں پاکستان کے پہلے وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کو سعد اکبر نامی ایک شخص نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ (بعد میں، میں نے وہ ہوٹل بھی دیکھا جہاں سعد اکبر لیاقت علی خان کو قتل کرنے سے پہلے رہا کرتا تھا) لیاقت باغ میں ہر وقت پولیس اور فوج کے سپاہی بیٹھے نظر آتے تھے۔ طلباء کے اس بھاری جلوس کو آگے بڑھتے دیکھ کر سپاہی فوراً مستعد ہو گئے، طلباء کے ہاتھوں میں ''جمہوریت بحال کرو''، ''پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ''، ''شہری حقوق واپس دو'' کے کتبے اٹھا ہوئے تھے۔ جوں ہی جلوس لیاقت باغ کے قریب پہنچ گیا پولیس حرکت میں آ گئی، طالب علموں نے شدید پتھراؤ کیا اور پولیس نے جوابی کاروائی کی، مجھے یہ دیکھ کر قدرے حیرت ہوئی کہ پاکستانی پولیس بھی پتھراؤ کرنے والوں پر پتھراؤ کرتی رہی۔ راولپنڈی کے علاوہ لاہور میں بھی ۱۴ر فروری کو یہ ''مظاہرہ'' کئی بار دیکھنے میں آیا کہ پولیس لوگوں پر پتھراؤ کرتی تھی۔

جس ٹیکسی میں سوار ہو کر میں صدر کی طرف جارہا تھا وہ ٹیکسی ڈرائیور صدر ایوب کا زبردست مخالف تھا۔ مجھ سے پوچھنے لگا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میں کل لاہور سے آیا ہوں۔

لاہور کی کیا حالت ہے؟

''وہاں بھی سخت گڑبڑ ہے'' میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے مخاطب ہو کر کہا۔

''میں کہتا ہوں کہ یہ سرحدی پولیس (فرانٹیر کانسٹیبلری) یہاں سے ہٹ

جائے، تو دو دن میں اس حکومت کا خاتمہ ہو جائے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ ظالم کس بے دردی سے لڑکوں کو مار رہے تھے۔ پنجاب پولیس ہوتی تو کبھی اس بے رحمی سے لاٹھی نہ چلاتی۔ٹیکسی ڈرائیور نے مجھ سے فریاد کی، اُسے شاید معلوم نہ تھا کہ اس نے کتنی بلیغ اور معنی خیز بات کہی تھی۔

بغاوت کی چنگاریاں اب شعلہ بن چکی تھیں۔ لاہور میں کرفیو کی معیاد بڑھادی گئی تھی۔ کراچی میں پولیس نے آرام باغ مسجد میں گھس کر نمازیوں پر لاٹھی چارج کیا تھا۔ اخبار ''مشرق'' میں آرام باغ مسجد میں گرے ہوئے خون کے دھبوں کی تصویریں شائع ہوئی تھیں اور پورے پاکستان میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ راولپنڈی اور لاہور دونوں شہروں میں روزنامہ ''کوہستان'' جو سرکار نواز پرچہ سمجھا جاتا تھا کے دفتروں کو لوٹ کر آگ لگائی گئی۔ رفتہ رفتہ پاکستان کا پریس بھی بغاوت سے متاثر ہونے لگا۔ اس سے پہلے ''نوائے وقت'' لاہور کے علاوہ کوئی اخبار کھل کر حکومت پر تنقید کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا، لیکن اب کچھ دنوں سے روزنامہ ''جنگ''، ''مشرق'' اور ''حریت'' ہی نہیں، پاکستان پریس ٹرسٹ کے اہتمام سے ہونے والے اخبارات یعنی ''پاکستان ٹائمز'' اور ''امروز'' بھی کھل کر بات کرنے لگے تھے۔ ہر اخبار میں مخالف لیڈروں کے بیانات اور ملک گیر مظاہروں کی تفصیلات نمایاں طور پر شائع ہونا شروع ہوگئیں۔ صدر ایوب پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے جانے لگے اور کسی اخبار میں یہ ہمت نہ تھی، کہ ان الزامات کے بے ہودہ پن کی طرف اشارہ کرے۔ مثلاً صدر پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ وہ دراصل میرزائی ہے اور اس لیے اس نے میرزائیوں کو فوج اور سول سروس میں کلیدی عہدوں پر تعینات کیا ہے۔ بچارے صدر کو یہ تردیدی بیان جاری کرنا پڑا کہ وہ حنفی

مسلمان ہیں۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے پر ان کا مکمل ایمان ہے اور
یہ کہ وہ ہرگز ہرگز میرزائی نہیں۔ پاکستان میں میرزائیوں کے خلاف عرصے
سے ایک سرد جنگ جاری ہے اور جمہوری مجلس عمل میں اکثر وہ لیڈر شامل تھے،
جنھوں نے ۱۹۵۳ء میں قادیانی احمدیوں کے خلاف ایسی زبردست ایجی ٹیشن
چلائی تھی کہ پورے پنجاب میں مارشل لاء نافذ کرنا پڑا تھا۔ ادھر ذوالفقار علی
بھٹو کی پیپلز پارٹی اور جماعت اسلامی کی اندرونی کشمکش بھی منظر عام پر آنے لگی
تھی۔ بھٹو کی پیپلز پارٹی سوشلزم کی علمبردار ہے اور مولانا مودودی کی جماعت
مکمل اسلامی نظام سے کم کوئی پروگرام قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ بھٹو کی
بڑھتی ہوئی مقبولیت نے اُس کی جماعت کے اثر ورسوخ کو بھی بہت بڑھا دیا
تھا اور جماعت اسلامی اس صورت حال سے مطمئن نہ تھی۔ لیکن دونوں ہی
جماعتیں صدر ایوب اور اس کے آمرانہ نظام کے خلاف صف آراء تھیں۔ اس
لیے بظاہر ان میں confrontation کا کوئی احتمال نہ تھا، لیکن جوں جوں
آمریت کے خلاف تحریک میں شدت آ گئی۔ دو مخالف اور متضاد نظریات میں
ٹکراؤ نمایاں ہونے لگا۔ کراچی میں کچھ لوگوں نے اسلام مردہ باد کے نعرے
لگائے اور جب میں نے پاکستانی اخبارات میں یہ خبر پڑھی، تو میری حیرت کی
کوئی انتہا نہ رہی۔ پاکستان کی سرزمین پر اسلام مردہ باد کے نعرے، میرے
لیے یقین کرنا مشکل ہو گیا۔ بعد میں جماعت اسلامی کی طرف سے یہ اعلان کیا
گیا کہ یہ نعرے بھٹو کی پیپلز پارٹی نے بلند کئے تھے اور پیپلز پارٹی نے اس کی
تردید کرتے ہوئے کہا کہ دراصل یہ نعرے جماعتِ اسلامی کے کارکنوں نے
اس لیے بلند کئے تھے، کہ پیپلز پارٹی کو بدنام کیا جائے۔ پاکستان میں میرے
قیام کے دوران یہ کشمکش اتنی بڑھ گئی کہ مسٹر بھٹو کی پیپلز پارٹی کو کئی بار اپنے اس

موقف پر زور دینے کی ضرورت پڑی کہ اسلام ہمارا دین ہے، جمہوریت ہماری سیاست ہے اور سوشلزم ہماری معیشت ہے۔ جب اس سے بھی بات نہ بنی، تو مسٹر بھٹو اور ان کی جماعت کو جماعت اسلامی کا مقابلہ کرنے کے لیے خود بھی مسلمان ہونا پڑا۔ ایک دن میں نے بیگم نصرت بھٹو کو راولپنڈی میں خواتین کے ایک جلوس کی رہنمائی کرتے ہوئے ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ'' کا علم اٹھاتے ہوئے بازاروں کا گشت کرتے ہوئے دیکھا۔

میں شام کو گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ عبد السلام یاتو اور غلام نبی گلکار تشریف لائے تھے اور کل پھر آنے کا وعدہ کر گئے ہیں۔ یاتو صاحب سے میرا غائبانہ تعارف ہے، ان کا نام میں نے پنڈت پریم ناتھ بزاز کی زبانی سنا تھا۔ وہ اس کسان کانفرنس کے لیڈر رہ چکے ہیں، جس نے بزاز صاحب کی حمایت، قیادت اور رفاقت میں جنم لیا تھا۔ اور جو ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں اس طرح بہہ گئی کہ ابھی تک اس کی لاش بھی دستیاب نہ ہو سکی ہے۔ یاتو صاحب نے اس سے پہلے مجھے کئی خطوط لکھے تھے۔ جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اب بھی شیخ صاحب ہی کو کشمیر کی ساری مصیبتوں کی جڑ سمجھتے ہیں اور اس لیے ان سے بے حد ناراض ہیں۔ پیپلز کنونشن کے سلسلے میں جب انہیں شرکت کا دعوت نامہ بھیجا گیا تھا تو انہوں نے اس کے جواب میں شیخ صاحب کو جو خط لکھا تھا (اس کی ایک نقل انہوں نے مجھے بھیجی تھی) وہ ان کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔ اس خط کا ماحصل یہ ہے کہ ''اب کاہے کو کنونشن کرتے پھرتے ہو، جب ہم نے بات کہی تھی، تو آپ نے وہ سنی نہیں۔ اب بیماری لاعلاج ہے۔ کنونشن کا فائدہ''؟

دوسرے دن یاتو صاحب سے ملاقات ہوئی۔ مجھے ایسا لگا کہ یہ وہ

''عبدالسلام یاتو'' نہیں ہوسکتا۔ جس سے میں غائبانہ طور متعارف ہوں۔ یہ صاحب تو بہت ہی شریف، نرم رو اور کم گو آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ انکی شخصیت میں جارحیت یا ناگواری کا کہیں شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ وہ کچھ اس خلوص سے ملے کہ جیسے مجھ سے بہت پرانی ملاقات ہو۔ رفتہ رفتہ نقاب اُلٹنے لگی اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ غائبانہ تعارف والے یاتو اور اس گوشت و پوست کے یاتو میں ایک گہری مماثلت ہے۔ یاتو صاحب کو پاکستان کی فضائیں راس نہیں آئی ہیں حالانکہ ان کے بچے یہیں جوان ہوکر برسر روزگار ہوگئے ہیں۔ یاتو صاحب کی ناآسودگی اور بے اطمینانی میں اُن سیاسی نظریات کا بھی دخل ہے جو انہیں اب بھی عزیز ہیں اور آج بیس سال بعد بھی ان کے لیے فرقہ پرست سیاست پر ایمان لانا ممکن نہیں ہوسکا ہے۔ ان کے خیال میں پاکستان کا حالیہ بحران بھی مذہب کو سیاست کے ساتھ خلط ملط کرنے کا ہی نتیجہ ہے۔ میں نے جب ان سے دریافت کیا کہ آیا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان موجودہ نفرت اور بے اعتمادی ختم ہونے کا کوئی امکان ہے؟ تو انہوں نے بڑی مایوسی کے ساتھ جواب دیا کہ اس کی جڑیں بہت گہری ہیں اور اس نفرت کی بنیادوں پر دونوں ملکوں میں بڑی بڑی ''دکانیں'' قائم ہیں، اس لیے جب تک ذہنوں میں انقلاب رونما نہ ہو۔ نفرت اور بے اعتمادی کی یہ دیواریں بلند سے بلندتر ہوتی جائیں گی۔

''آپ پاکستان کیسے آئے''؟ یاتو صاحب کی یہ باتیں سن کر مجھے کچھ حیرت ہوئی اور اس لیے میں نے دریافت کیا ''یہ ایک روح فرسا داستان ہے۔ میں آیا نہیں لایا گیا ہوں۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ بھیجا گیا ہوں۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں قبائلی حملے کے فوراً بعد مجھے گرفتار کیا گیا۔ میں ۱۹۵۱ء تک جیل میں

تھا۔ جب شیخ صاحب نے ۱۹۵۱ء میں آئین ساز اسمبلی کے انتخابات منعقد کرانے کا اعلان کیا تو بخشی غلام محمد کے کچھ آدمی جو مجھ سے جیل میں ملے، کہنے لگے کہ مجھے اس شرط پر رہا کر دیا جائے گا کہ میں اننت ناگ میں مرزا افضل بیگ کے خلاف الیکشن لڑوں۔ میں نے اس خیال سے کہ شاید یہ مجھے الجھانے کی کوئی سازش ہو، انکار کر دیا۔ بعد میں ایک دن مجھے بیگ صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا اور میں نے بیگ صاحب سے یہ سارا واقعہ بیان کیا کہ مجھے ان کے خلاف ''الیکشن'' لڑنے کے لیے آمادہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن میں نے انکار کر دیا ہے۔ اسکے کچھ عرصہ بعد ایک کیبنٹ میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا کہ مجھے پاکستان بھیج دیا جائے۔

7

راولپنڈی کے حالات روز بروز بگڑتے جارہے تھے۔ طالب علم لیڈر شیخ عبدالرشید گرفتار کیئے گئے تھے اور ان کی رہائی کے لیے طلباء روز مظاہرہ کرتے، ادھر شبنم غزالہ نامی ایک لڑکی نے انسپکٹر جنرل پولیس پر یہ الزام لگایا کہ خود آئی جی پی نے اُسے اغوا کیئے جانے کی دھمکی دی ہے۔ اس پر اخبارات میں خاصا ہنگامہ ہوا۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے تردید کی، لیکن اس کی کون سنتا۔ پاکستان کے دوسرے شہروں سے بھی تشویشناک اطلاعات آرہی تھیں۔ صدر ایوب کے اپنے گھر ہزارہ میں بھی فسادات کی آگ پھیل چکی تھی۔ خاص طور پر مغربی پاکستان میں اس بات پر حیرت کا اظہار کیا جارہا تھا کہ بنگالیوں نے فوج کی بھی پرواہ نہیں کی اور جس دن ڈھاکہ شہر میں ۲ے گھنٹے کا کرفیو نافذ کر کے اُسے فوج کے حوالے کردیا گیا، اُسی دن تقریباً ڈیڑھ لاکھ آدمیوں نے کرفیو کی خلاف ورزی کر کے ایک جلوس نکالا۔ اس پریشان کن صورت حال کے پیش نظر اب ہر شخص یہی سوچ رہا تھا کہ صدر ایوب مارشل لاء نافذ کریں گے۔ اس وقت مارشل لاء نافذ کردیا جاتا، تو کسی کو حیرت نہ ہوتی، ہر شخص ذہنی طور پر اس کے لیے تیار تھا۔ مجھے اور میری طرح بہت سے لوگوں کو حیرت تھی، تو اس بات پر کہ صدر مارشل لاء کا اعلان کیوں نہیں کرتے۔

بہت دنوں بعد معلوم ہوا کہ مارشل لاء کا نفاذ بھی صدر کے اپنے بس کی بات نہیں تھی، وہ اتنے بے بس اور بے دست و پا ہو چکے تھے کہ فوج بھی ان کا حکم ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ۲۵/ مارچ کو جب

پاکستان میں مارشل لاء کا اعلان کیا گیا تو اُس سے پہلے صدر کو صدارت سے سبکدوش ہونا پڑا۔

صدر ایوب کے خلاف پاکستانی عوام کی اس بے پناہ نفرت کا سبب کیا تھا؟ پاکستان میں اپنے قیام کے دوران میں نے یہ جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی، سیاستدانوں، صحافیوں، تاجروں اور طالب علموں سے میں نے صدر کے خلاف اس شدید نفرت اور بیزاری کا سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اصلی وجہ یہ ہے کہ صدر نے اپنے بیس سالہ دور حکومت میں ہر طرح کی شہری آزادی کو سلب کر دیا تھا۔ اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر صرف صدر کی عظمت اور ان کی اعلیٰ کارکردگی کے گیت گائے جاتے تھے اور دس سال کی اس یک رنگی بلکہ بے رنگی سے پاکستانی عوام اس درجہ اکتا چکے تھے کو وہ کوئی بہت بڑی تبدیلی چاہتے تھے۔

ایک نوجوان طالب علم سے جب میں نے یہ پوچھا کہ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ایوب خان نے اپنے دس سالہ دور حکومت میں پاکستان کو سیاسی استحکام عطا کیا تو اس کی بھویں تن گئیں۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے اُسے کوئی گالی دی ہے۔ سیاسی استحکام؟ تم ہندوستانیوں کو یہ سیاسی استحکام کی اصطلاح بہت مرغوب ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ ایسا سیاسی استحکام کس ملک کو حاصل نہیں ہو سکتا؟ ملک کو فوج کے حوالے کر دو، وہاں کے رہنے والوں کی زبانیں بند کر دو اور سیاسی استحکام حاصل ہو گیا میں پوچھتا ہوں کہاں گیا وہ سیاسی استحکام آج؟ سیاسی استحکام نام ہے سیاسی نظام اور آئینی اداروں کا استحکام۔ آپ کو پاکستان میں کوئی سیاسی نظام نظر آ رہا ہے آج؟ نوجوان طالب علم نے اس انداز سے کہا کہ جیسے وہ کسی عام جلسے میں تقریر کر رہا ہو۔

''لیکن اس بات سے تو آپ بھی انکار نہ کریں گے کہ صدر ایوب کے دور میں پاکستان نے صنعتی اور اقتصادی میدان میں کافی ترقی کی؟'' میں نے مزید کچھ جاننے کے لیے نوجوان طالب علم کو چھیڑا۔

''لیکن پاکستان صرف صنعتی ترقی کے لیے حاصل نہیں کیا گیا تھا۔ کیا مشترکہ ہندوستان کا حصہ ہوتے ہوئے کراچی لاہور یا ڈھاکے میں صنعتی ترقی ممکن نہیں تھی؟ صدر ایوب نے پاکستان کی اساس کو ہی ختم کر دیا جن لوگوں نے ملک کے قیام کے لیے بیش بہا قربانیاں دیں، انہی لوگوں کو پاکستان میں بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس ملک پر حکومت کا حق نہیں ہے۔ حکمرانوں پر تنقید کا حق نہیں ہے اور آپ کہتے ہیں کہ یہاں صنعتی اور اقتصادی ترقی ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ لعنت ہے ایسی ترقی پر۔ انسان صرف صنعتی ترقی کے لیے نہیں جیتا اپنے ضمیر کی آزادی ۔کے لیے زندہ ہے اور ہم لوگوں کو پاکستان میں یہی آزادی حاصل نہیں۔نوجوان طالب علم نے پر جوش لہجے میں کہا۔

اس شام ایک ٹیکسی ڈرائیور نے صدر کے خلاف پاکستانی عوام کی نفرت اور بیزاری کا ایک اور اہم سبب بھی بیان کیا۔ میں صابر صاحب کے ساتھ میر مقبول صاحب گیلانی سے ملنے جا رہا تھا، راستے میں، میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا کہ وہ صدر کا حامی ہے یا مخالف؟ ٹیکسی ڈرائیور نے صدر کے نام ایک موٹی سی گالی دی اور کہا ''پاکستان میں اس کے اپنے بیٹوں کے سوا اس کا کوئی حامی نہیں''۔ اور صدر تو سب پاکستانیوں کو اپنا بیٹا کہتا ہے اس کا مطلب ہے کہ سب لوگ اس کے حامی ہیں''۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے مذاق کیا۔ نشانہ ٹھیک بیٹھ گیا اور ٹیکسی ڈرائیور نے تقریر شروع کی۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ ایوب خان شروع شروع میں بہت اچھا آدمی تھا۔ اس نے پاکستان کو تباہ ہونے سے بچالیا۔ لیکن جوں جوں وہ خود مضبوط ہوتا گیا، اس نے اور اس کے بیٹوں نے پاکستان کی جڑیں کاٹنا شروع کر دیں۔ خاص کر اسکے بیٹوں اور دوسرے رشتہ داروں نے پچھلے چھ سات سال سے وہ دھاندلی مچائی ہے کہ خدا کی پناہ! اس کے بیٹے گوہر ایوب نے صرف چار سال کے اندر ۳ کروڑ روپیہ کمایا ہے۔ اسی طرح یعقوب اور نجیب (صدر کے داماد) نے اتنی زمینیں خریدی ہیں کہ اس وقت وہ پاکستان کے سب سے بڑے زمیندار ہیں۔ دولت کمانے کے ساتھ ساتھ صدر کے بیٹوں نے شریفوں کی عزت وعصمت پر بھی ہاتھ ڈالنا شروع کیا اور یہ باتیں یا تو صدر تک پہنچ نہیں پائیں یا اُنہوں نے سن کر ان سنی کر دیں۔ ایک بار کراچی میں تقریر کرتے ہوئے صدر نے کہا کہ میرے بیٹوں کے خلاف یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے بے تحاشا دولت بنائی ہے۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ وہ بہت اچھے بزنس مین ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ صدر اپنے بیٹوں کی کرتوت سے واقف تھے اور انہیں صدر کی طرف سے مکمل آزادی حاصل تھی۔ کیا ایسا آدمی کسی اسلامی سلطنت کا صدر ہونے کے قابل ہے''۔

ٹیکسی ڈرائیور نے صدر کے زوال کا جو تجزیہ کیا تھا۔ وہ بہت حد تک بے لاگ اور حقیقت پسندانہ تھا، پاکستان میں اپنے قیام کے دوران میں نے صدر صاحب کے فرزندوں اور رشتے داروں کے ''کمالات'' کی وہ کہانیاں سنیں کہ مجھے حیرت ہوئی، کہ پاکستانی عوام نے یہ سب کچھ اتنی دیر کے لیے برداشت کیسے کیا۔ صدر پر یہ الزام تھا کہ وہ کھلم کھلا اپنے بیٹوں کی نہ صرف طرفداری کرتے تھے بلکہ ان کی خوشحالی میں اضافہ کرنے کے لیے ان کی عملی اعانت

کرتے تھے۔ میرے چچا عبدالرحیم نے مجھے بتایا کہ ضلع ہزارہ میں صدر کے داماد نجیب اللہ نے ان کی زمین پر زبردستی قبضہ کیا، تو انہوں نے صدر کو متعدد خط لکھے، کہ وہ اپنے داماد کو زبردستی کرنے سے روکے، صدر کو یہ خطوط ملے لیکن انہوں نے کوئی موثر کارروائی نہیں کی۔ چچا رحیم نے بھی ٹیکسی ڈرائیور کے بیان کی تصدیق کی۔ انہوں نے کہا ''صدر نہایت ہی قابل اور مخلص آدمی ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ اُسے اپنے بیٹوں اور دامادوں نے بدنام کر دیا ہے''۔

صدر کے خلاف ایک اور الزام ہے اور اس کا تعلق کشمیر سے ہے۔ اور پاکستان میں اکثر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ صدر کے خلاف فوری بغاوت کی اصل وجہ یہ ہے کہ صدر موثر طور اس الزام کی تردید نہ کر سکے۔ یہ الزام پاکستان کے سابق وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کی تخلیق، تصنیف اور تالیف ہے۔ جب مسٹر بھٹو کو وزیر خارجہ کی حیثیت سے مستعفی ہونے کے لیے مجبور کیا گیا اور وہ بیرونی دورے سے فارغ ہو کر پاکستان لوٹے، تو وہ صدر ایوب سے اپنا حساب چکانے کے لیے ملک میں ایک سیاسی تحریک چلانا چاہتے تھے۔ وہ صدر کے ایک رفیق کی حیثیت سے ان کی سبھی کمزوریوں سے واقف تو تھے لیکن پاکستان میں کوئی عوامی ابھار پیدا کرنے کے لیے صدر کی کمزوریوں کا ہی نہیں، پاکستانی عوام کی کسی کمزوری کا سہارا لینا بھی ضروری تھا اور بھٹو کو پاکستانی عوام کی اس کمزوری کا علم تھا۔ اس کا نام ہے، کشمیر! کشمیر ہر پاکستانی کی سب سے بڑی کمزوری ہے اور پاکستانی عوام سے آپ کشمیر کے نام پر کوئی بھی قربانی مانگ سکتے ہیں۔ کشمیر کے سوال پر ہر پاکستانی اتنا جذباتی ہو جاتا ہے کہ اُسے پھر آگے کچھ اور سوچنے کی فرصت نہیں ملتی۔ رکشا ڈرائیور سے لے کر یونیورسٹی کے پروفیسر تک کشمیر کے معاملے میں سوچ اور فکر کی ایک ہی سطح ہے اور پاکستانی

حکمرانوں نے اسی کمزوری کو اپنے اقتدار اور استحکام کے لیے ہمیشہ استعمال کیا ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستانی عوام نے اپنی حکومت کا صرف اس لیے ساتھ دیا تھا کہ انہیں یہ یقین دلایا گیا تھا کہ یہ جنگ کشمیر کے حصول کے لیے لڑی جارہی ہے اور جب ''معاہدہ تاشقند'' کی رُو سے دونوں ملکوں کو اپنی اپنی سرحدوں پر واپس جانے کے لیے کہا گیا تو پاکستانی عوام میں مایوسی اور شکست خوردگی کا احساس پھیل گیا۔ پاکستانی حکمران یہ تو کہہ نہیں سکتے تھے کہ انہوں نے جنگ ہاری ہے۔ وہ برابر یہ کہتے رہے کہ انہیں اس جنگ میں فتح حاصل ہوئی ہے اور پاکستانی عوام یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ فاتح ہونے کے باوجود ہم نے لڑائی بند کیوں کر دی ہے اور چھمب جوڑیاں کے مفتوحہ علاقے کو واپس کیوں کر رہے ہیں؟ یہ اُسی الجھن کا نتیجہ ہے کہ معاہدہ تاشقند پر دستخط ہو جانے کے بعد کراچی میں طلباء نے زبردست مظاہرے کیے۔ جس میں دو طالب علم ہلاک ہو گئے۔ آج تین سال بعد بھی پاکستانی عوام ''تاشقند'' کی منطق کو نہیں سمجھ پائے ہیں اور اسی صورت حال سے فائدہ اٹھا کر مسٹر بھٹو نے صدر ایوب کے خلاف اپنے ترکش کا پہلا تیر آزمایا۔ بھٹو نے پاکستانی عوام سے کہا کہ اگر صدر ایوب امریکہ اور روس کے دباؤ میں آ کر ستمبر ۱۹۶۵ء میں جنگ بندی پر آمادہ نہ ہوتے تو چند دنوں کے اندر اندر کشمیر ہی نہیں، دلی کے لال قلعے پر بھی پاکستان کا جھنڈا لہراتا نظر آتا، مسٹر بھٹو نے کہا کہ تاشقند میں بھی صدر ایوب نے امریکہ اور روس کے ساتھ مل کر کشمیر کا سودا کر ڈالا۔ اور میں وقت آنے پر پاکستانی عوام کو بتاؤں گا کہ تاشقند میں کیا سودا ہوا ہے'' مسٹر بھٹو نے اپنی کسی تقریر میں تاشقند، کی تفصیلات بیان نہیں کیں۔ انہوں نے اپنی ہر تقریر میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ میں وقت آنے پر تاشقند کی پوری حقیقت بیان کروں گا

اور پاکستانی عوام کو یہ بتاؤں گا کہ تاشقند میں ایوب خان نے کس طرح کشمیر کا سودا کیا۔ پاکستانی عوام پہلے ہی confuse تھے، بھٹو نے اس confusion میں مزید اضافہ کیا۔ صدر ایوب سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ وہ بھٹو سے کہہ دیتے کہ بتاؤ تاشقند میں کیا ہوا؟ صدر کی خاموشی نے پاکستانی عوام کے اس گمان کو یقین میں بدل دیا کہ ہو نہ ہو معاہدۂ تاشقند کی رُو سے کشمیر کا سودا کر دیا گیا ہے۔ بس پھر کیا تھا صدر ایوب کے خلاف نفرت اور بغاوت کا وہ لاوا پھوٹنے لگا، جو دس سال کی زبان بندی کی وجہ سے اندر ہی اندر پک رہا تھا۔ صدر ایوب نے تاشقند کے معاملے پر ذوالفقار علی بھٹو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے سیلاب کو روکنے کے لیے انہیں گرفتار کر لیا۔ اس گرفتاری سے کئی اور بند ٹوٹ گئے۔ ائیر مارشل اصغر خان نے سیاست میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا اور اس کے ساتھ ہی دس برس کی پُر اسرار خاموشی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ابھی تک ''تاشقند'' کا راز افشا نہیں کیا ہے۔ اور جب ۱۷ فروری کو کراچی میں قائداعظم کے مزار پر لوگوں نے تاشقند، تاشقند کے نعرے لگا کر بھٹو سے تاشقند کا راز افشا کرنے کے لیے کہا، تو بھٹو نے جواب دیا کہ ''تاشقند تو اب پرانی بات ہو چکی ہے۔ اب تو نئے معاہدے ہونے لگے ہیں۔ ان کی بات کیجیے'' اس طرح بھٹو نے تاشقند کا نام لے کر صدر ایوب کی ناؤ کو ڈبو دیا۔

راولپنڈی کشمیریوں کا سب سے بڑا مرکز ہے اور ''آزاد کشمیر'' کی اکثر سیاسی جماعتوں کے صدر دفاتر یہیں پر قائم ہیں۔ ''آزاد کشمیر'' کے سبھی اخبارات بھی یہیں سے شائع ہوتے ہیں۔ (مظفر آباد میں ابھی تک کوئی پریس نہیں ہے) اس طرح کشمیر کی سیاست کا اصل بازار راولپنڈی میں ہی لگتا ہے اور وزارتِ امور کشمیر کا دفتر بھی چونکہ اسلام آباد میں ہی ہے، اس لیے سیاسی

معرکہ آرائیوں کا اصلی مرکز مظفر آباد کی بجائے راولپنڈی ہے اور آزاد کشمیر کی سیاست کے اکثر طالع آزما آزاد کشمیر کے صحراؤں کی خاک چھاننے کی بجائے وزارتِ امور کشمیر کا ہی ''طواف'' کرتے ہیں۔ کیونکہ آزاد کشمیر پر وہی شخص حکومت کر سکتا ہے جسے اس دربار سے پروانہ مل سکے، یہ پروانہ چیف ایڈوائزر جاری کرتا ہے۔ جو عام طور پر منسٹری کا سیکریٹری ہوتا ہے۔ اس کی مرضی سے حکومتیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ آزاد کشمیر کا صدر چیف ایڈوائزر کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتا ہے اور جب کبھی کوئی صدر چیف ایڈوائزر سے برابری کرنے کی حماقت کرتا ہے تو اُسے بیک بینی و دوگوش صدارت سے برخواست کر دیا جاتا ہے۔ کے۔ ایچ۔ خورشید کو آزاد کشمیر کی صدارت سے اس لیے ہاتھ دھونا پڑا، کہ اس کے متعلق منسٹری آف کشمیر افیئرس کو یہ شبہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو واقعی صدر سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہو رہا ہے۔ آزاد کشمیر اور پاکستان کے اس ''منفرد'' آئینی رشتے کے خلاف محبّ وطن کشمیریوں میں شدید ناراضگی اور بیزاری کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اس توہین آمیز سلوک کے خلاف اکثر کشمیری وقتاً فوقتاً احتجاج کرتے آئے ہیں۔ لیکن وزارت امور کشمیر نے اس احتجاج کے باوجود ''آزاد کشمیر گورنمنٹ ایکٹ ۱۹۶۸ء'' نافذ کر دیا۔ (جو اس اخبار کی ۱۸/ مارچ کی اشاعت میں شائع ہوا ہے) اور جس کی رو سے آزاد کشمیر حکومت کی حیثیت میونسپل کمیٹی سے بھی زیادہ حقیر بنا دی گئی ہے۔ آزاد کشمیر اور اہل کشمیر کے تئیں حکومتِ پاکستان کے اس استعماری رویے نے بہت سے کشمیریوں کو پاکستان سے اس قدر برگشتہ کر دیا ہے کہ وہ اب ایک خود مختار کشمیر کا خواب دیکھنے لگے ہیں۔ ایک ایسا کشمیر جہاں نہ ہندوستان کا تسلط ہوگا اور نہ پاکستان کی نمبرداری، جہاں کشمیری اپنی مرضی سے اپنی تقدیر بنانے

کے مجاز ہوں گے، اور یہ کشمیر ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ روس، امریکہ، برطانیہ اور دنیا کے دیگر بڑے بڑے ممالک کے ساتھ براہِ راست دوستانہ تعلقات قائم کرے گا۔ خودمختار کشمیر کا یہ خواب دیکھنے والے وہی دیوانے ہیں جنہوں نے پاکستان کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں اور جو اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف اس لیے پاکستان آئے تھے کہ شیخ محمد عبداللہ نے ایک ''ہندو ملک'' کے ساتھ ناطہ جوڑ کر ان کے وطن کو ناپاک کر دیا تھا۔ آج بائیس سال کے تجربے کے بعد یہ مہاجر پاکستان کی ''حقیقت'' سے بھاگ کر ''آزاد اور خودمختار کشمیر'' کے خوابوں میں پناہ لینا چاہتے ہیں۔ اپنے اس خواب کی تعبیر کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہیں۔ آزاد اور خودمختار جموں و کشمیر کی تحریک کو یوں تو پاکستان اور آزاد کشمیر میں مقیم سبھی کشمیریوں کی حمایت حاصل ہے لیکن جن لوگوں نے اسے اپنی زندگی کا مقصد اور اپنی قوم کا مقدر سمجھ لیا ہے۔ ان میں غلام نبی گلکار کا نام سرفہرست ہے۔

غلام نبی گلکار کو میں نے بچپن میں ایک یا دو بار دیکھا ہے۔ یہ غالباً ۱۹۴۳ء یا ۴۴ء کی بات ہے۔ میں ان دنوں اپنے آبائی گاؤں ناسنور میں زیر تعلیم تھا۔ میرے والد کے بغیر ناسنور کا سارا گاؤں قادیانی تھا اور قادیانیوں نے کسی مذہبی جھگڑے کی بناء پر میرے والد کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ غلام نبی گلکار جو قادیانی احمدیوں کے سربراہ تھے۔ ناسنور تشریف لائے تھے اور انہوں نے مجھ سے بھی کچھ پوچھ گچھ کی تھی۔ باوجود اس کے کہ وہ میرے والد کے مخالف تھے میں ان کی شخصیت سے مرعوب بلکہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ ایک گہرے نیلے رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھے اور میں نے پہلی بار ایک قادیانی احمدی کو ٹائی اور سوٹ پہنے ہوئے دیکھا تھا اس کے

بعد گلکار صاحب کی سرگرمیوں کے بارے میں کبھی کوئی بات سننے میں نہیں آئی اور میرے ذہن میں ان کی وہ تصویر پھرنے لگی، جو میں نے ایامِ طفولیت میں قریب سے دیکھی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں وہ تصویر بھی کھوگئی اور آج ۲۴، ۲۵ سال کے بعد جب گلکار صاحب کو موہن پورہ راولپنڈی کے ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں چادر اوڑھے دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ تصویر تو وہی ہے لیکن گردش زمانہ نے اس پر گرد کی موٹی موٹی تہیں جمادی ہیں۔ گلکار صاحب نے چچا صابر کو میرے ساتھ دیکھ کر یہ اندازہ کرلیا کہ میں کون ہوں۔ السلام علیکم کا زوردار نعرہ لگا کر مجھ سے کچھ اس طرح بغل گیر ہوگئے کہ جیسے آج بیس سال سے میرے ہی انتظار میں بیٹھے تھے۔

غلام نبی گلکار کے متعلق صابر صاحب نے مجھے پہلے ہی خبردار کردیا تھا کہ اُن سے بحث کرکے ان کو قائل کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ وہ قائل کرنے پر یقین رکھتے ہیں قائل ہونے میں نہیں۔ گلکار صاحب سے دو گھنٹے کی بات چیت کے بعد مجھے چچا صابر کے بیان کی صحت کا یقین تو ہوگیا لیکن میں پہلی بار نظر میں گلکار صاحب کے خلوص، ان کی حب الوطنی، ایمانداری اور جرأت رِندانہ کا بھی قائل ہوگیا!

گلکار صاحب ان معدودے چند کشمیریوں میں سے ہیں، جنہوں نے دولت، جائیداد، عزت، حشمت اور حکومت سب کچھ ٹھکرا کر صرف کشمیر کے درد کو سینے سے لگایا ہے۔ انہوں نے کشمیر کی عزت و آبرو کو وظیفوں اور کلیموں (Claims) کی نذر چڑھانے سے انکار کردیا۔ اُنہیں جنونی، مخبوط الحواس کہہ کر پکارنے والوں کی پاکستان میں کمی نہیں، لیکن ان کا کوئی دشمن بھی ان پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ اس نے کبھی لالچ دباؤ میں آکر اپنے موقف سے انحراف

کیا ہو، وہ شروع سے لے کر اب تک آزاد اور خود مختار کشمیر کے حامی ہیں اور پاکستانی حکومت سے برسرِ پیکار۔ ان کے عزم کو جیل کی تنگ و تاریخ کوٹھریاں بھی پامال نہ کرسکیں۔ حتیٰ کہ جیل کی آہنی سلاخوں سے بھی اُنہوں نے آزاد اور خود مختار کشمیر کا نعرہ بلند کیا۔ گلکار صاحب نے اخبارات میں ایک طویل سلسلہ مضامین شائع کر کے ''خود مختار کشمیر'' کی سیاسی، اقتصادی اور جغرافیائی اہمیت کو واضح کیا ہے اور خود مختار کشمیر کے مخالفین کے ہر اعتراض کا مسکت جواب دیا ہے۔ انہیں اپنے وطن سے عشق ہے اور وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ ریاست جموں و کشمیر کی عزت اور آبرو اس میں ہے کہ وہ ہندوستان اور پاکستان دونوں سے دوستانہ تعلقات قائم کر کے آزاد اور خود مختار رہے۔ انہیں اپنے موقف کی صحت اور سلامتی کا اس درجہ یقین ہے کہ وہ اس کے خلاف کوئی دلیل سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کے۔ ایچ۔ خورشید کے خلاف صدراتی اُمیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑتے وقت بھی انہوں نے اپنا نصب العین ''آزاد اور خود مختار کشمیر'' قرار دیا تھا۔ وہ انتخاب ہار گئے، لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری ہے۔ کشمیر کے مستقبل پر گلکار صاحب کا غیر متزلزل اعتماد ایک ایسے عاشق کی یاد دلاتا ہے جو اپنے محبوب کی بے وفائی کے بعد بھی اُسی کے نام کی مالا جپتا ہے۔ گلکار صاحب اپنے وطن سے سینکڑوں میل دور موہن پورہ کے ایک خستہ و شکستہ مکان میں پناہ گزین ہیں، لیکن انہوں نے سرینگر کی خوبصورتی کے لیے ایک جامع سکیم تیار کی ہے۔ وہ بظاہر اپنے وطن لوٹنے تک کے مختار نہیں لیکن وہ ریاست جموں و کشمیر کو خود مختار بنانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان کے اکثر دوست ان کے جذب و جنون پر ہنستے ہیں، لیکن انہیں اس کی پرواہ نہیں۔ مجھ سے کہنے لگے ''میں شاید اپنے خواب کی تعبیر دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہ سکوں،

لیکن مجھے یقین ہے کہ تم ضرور دیکھو گے"۔

غلام نبی گلکار بڑا ہی غریب آدمی ہے لیکن اُسے اپنی غربت کا نہیں، غریب الوطنی کا شدید احساس ہے۔ صابر صاحب نے مجھے بتایا کہ گلکار چاہتے تو انہیں بھی کوٹھیاں اور درآمدی لائسنس مل سکتے تھے، لیکن اس نے کسی .... پاکستان کی حکومت کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے۔ وہ پاکستان میں سیکولرازم، فرقہ وارانہ بھائی چارے اور باہمی یگانگت کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ اس نے سیکولرازم اور نیشنلزم پر پاکستانی اخبارات میں بڑے عالمانہ مضامین لکھے ہیں اور ان کے بعض مضامین پڑھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی۔

8

میر مقبول گیلانی صاحب ۱۹۴۷ء میں اوڑی کے ایمرجنسی آفیسر تھے اور انہوں نے پاکستانی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے میں ہندوستانی افواج کی شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ پاکستانی فوج نے میر صاحب کے سر کی قیمت دس ہزار روپے مقرر کی تھی کہ جو شخص انہیں زندہ یا مردہ پکڑ کر لائے اُسے دس ہزار روپے انعام دئے جائیں گے۔ آج یہی میر مقبول صاحب پاکستان میں بہت ''اہم'' شخصیت کے مالک ہیں۔ وہاں ان کا بڑا اثر ورسوخ ہے اور ان کا شمار ان معدودے چند کشمیریوں میں ہوتا ہے جن کی پاکستانی حکمران بڑی عزت کرتے ہیں۔ میر صاحب کی رسائی حکومت کے اونچے اونچے ایوانوں تک ہے اور مجھے معلوم ہوا کہ پاکستانی فوج کو ان پر بڑا اعتماد ہے۔ اسے کہتے ہیں وقت وقت کی بات۔

میر مقبول صاحب ''پونچھ ہاؤس'' کے ایک حصے میں مقیم ہیں اور ۲۳ر جنوری کو جب میں چچا صابر کے ساتھ ان کے ہاں گیا تو وہ صاحب فراش تھے۔ ان کے چہرے کے بائیں حصے پر فالج کا اثر تھا اور وہ بڑی مشکل سے بات کر سکتے تھے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ اسی حالت میں اٹھ بیٹھے۔ میں نے میر صاحب کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا لیکن کبھی انہیں دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۵۷ء میں ہندوستان سے ان کے فرار کی کہانی میں نے سنی تھی کہ وہ کس طرح ہندوستانی پولیس کی آنکھوں میں دھول جھانک کر پاکستان بھاگ آئے تھے۔ میری خواہش تھی کہ ان سے اس ڈرامائی فرار کا

احوال پوچھوں، لیکن ان کی حالت دیکھ کر میں نے مناسب نہ سمجھا۔ میر صاحب نے میرے والد سے دوستی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ”مولوی عبداللہ کے خاندان میں یوں تو سبھی سے میرے گہرے تعلقات تھے، لیکن دوستی صرف محمد یعقوب (میرے والد) سے تھی“۔ انھوں نے اپنے بہت سے دوستوں کے متعلق دریافت کیا کہ کہاں ہیں اور کیسے ہیں؟ وہ ان دنوں اپنی بیوی کے لیے بہت پریشان تھے۔ انہوں نے شکایت کی کہ ہندوستانی پولیس ان کی بیوی کو بہت پریشان کرتی ہے اور حکومت ہند کی طرف سے انہیں پاکستان آنے کی اجازت نہیں دی جاتی (ان کی بیگم کو پاکستان جانے کی اجازت دی گئی اور میرا خیال ہے کہ وہ ابھی تک پاکستان ہی میں ہیں) میر صاحب نے مجھ سے وعدہ لیا کہ روانہ ہونے سے پہلے میں ایک بار پھر ان سے ضرور مل لوں گا۔ اسی اثناء میں غلام محمد ترالی تشریف لائے، ترالی صاحب راولپنڈی میں آزاد کشمیر حکومت کے ریلیشنز آفیسر ہیں۔ انہوں نے اصرار کیا کہ کچھ وقت نکال کر ان کے ساتھ چائے پی لوں، میں نے معذرت کی اور ساتھ ہی وعدہ کیا کہ مظفر آباد سے واپسی پر ان سے ملے بغیر نہ جاؤں گا۔

شام کو میر عبدالعزیز (ایڈیٹر انصاف) تشریف لائے۔ ابھی تک ان سے تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ اس لیے ہم نے آج شام کا وقت مقرر کیا تھا کہ ”حالات حاضرہ“ پر تبادلہ خیال ہو سکے۔ میر صاحب میرے چچا مشتاق (جو پاکستان جا کر ایم۔ اے۔ فاروق ہو گئے ہیں) کے بڑے گہرے دوست تھے، لیکن کچھ عرصہ سے ان دونوں میں سخت ان بن ہو گئی ہے اور ان دنوں دونوں دوست اپنی دوستی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے ایک دوسرے کی پگڑی اچھالنے میں مصروف تھے۔ میر صاحب نے چچا مشتاق سے اپنے اختلافات کا

ذکر کرتے ہوئے اس سیاسی پس منظر کو پیش کیا کہ جس کی وجہ سے محاذ رائے شماری میں پھوٹ پڑ گئی اور محاذ کے دو حصے ہو گئے۔ میر صاحب کے بیان کے مطابق انہیں محاذ رائے شماری سے الگ ہو کر اپنا ایک الگ محاذ بنانے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ محاذ پر امان اللہ، عبدالخالق انصاری، مقبول، میجر امان اللہ اور اکرام اللہ جسوال جیسے انتہا پسندوں کا غلبہ ہو گیا تھا؛ اور یہ لوگ امان اللہ جیسے مہم پسندوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے اور مشتاق نے چونکہ ان ہی لوگوں کی حمایت کی، اس لیے مجھے بیس سالہ دوستی کو الوداع کہہ کر ان سے الگ ہونا پڑا۔ میر صاحب نے محاذ رائے شماری کے آئین میں ترمیم کا ایک نوٹس دیا تھا جس کی رُو سے محاذ رائے شماری برائے آزاد کشمیر و پاکستان کو محاذ رائے شماری ریاست جموں کے آئین کے مطابق ڈھالنا تھا۔ لیکن مجلس عاملہ کے اکثر ممبروں نے اس کی مخالفت کی، اس لیے میر صاحب نے محاذ سے استعفیٰ دے کر ایک الگ محاذ رائے شماری بنا ڈالا اور ۱۹۶۵ء کے ایک مہاجر محمد شریف طارق کو جو راجوری میں وکیل تھے، اس کا صدر بنایا۔ دونوں جماعتیں اپنے آپ کو محاذ رائے شماری کہتی ہیں۔ میر صاحب کے مخالف ان کے محاذ کو عزیز میری محاذ کہتے ہیں اور میر صاحب نے مخالف محاذ کا نام محاذ رائے شماری برائے عبدالخالق انصاری رکھا ہے۔ (انصاری صاحب محاذ کے صدر ہیں)

دونوں محاذوں میں ایک بنیادی فرق ہے کہ عبدالخالق انصاری کا محاذ لامحدود رائے شماری کا قائل ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ اہل کشمیر کے انتخاب کو ہندوستان اور پاکستان تک ہی محدود نہیں رکھنا چاہتا بلکہ ان کو کوئی تیسرا راستہ اختیار کرنے کا حق بھی دینا چاہتا ہے۔ اس طرح ان کے خیال میں رائے شماری کے حق کو محدود کی بجائے لامحدود کر دینا چاہیے۔ اس کے مقابلے میں

عبد العزیز: میر کے محاذ کا موقف یہ ہے کہ رائے شماری صرف سلامتی کونسل کی قرار دادوں کی روشنی میں ہونا چاہیے اور ان قراردادوں کے مطابق ریاستی لوگوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ ہندوستان یا پاکستان دو میں کسی کے ساتھ الحاق کریں۔ میر صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کی محاذ رائے شماری کے آئین میں بھی اسی موقف پر زور دیا گیا ہے اور اگر ہم جائز طور پر اپنے آپ کو شیر کشمیر، اور میرزا محمد افضل بیگ کے محاذ کا جانشین سمجھتے ہیں، تو ہمیں وہی کہنا چاہیے جو وہ کہتے ہیں میر صاحب کے خیال میں لامحدود رائے شماری کا نعرہ دراصل چینی خطرے کی نشان دہی کرتا ہے اور وہ یہ نہیں چاہتے کہ کشمیر ہندوستان اور پاکستان کی کشمکش سے آزاد ہوکر چین کی آغوش میں چلا جائے۔ بہت دیر تک اس موضوع پر باتیں ہوتی رہیں اور آخر میں میں نے میر صاحب سے کہا کہ یہ جو آپ محدود اور لامحدود رائے شماری کے چکر میں پھنسے ہوئے ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار ہیں۔ اسکا صحیح صورت حال سے تعلق کیا ہے؟ کیا آپ رائے شماری کو اتنا قریبی اور یقینی امر سمجھتے ہیں کہ آپ نے ابھی سے محدود اور لامحدود کا جھگڑا کھڑا کیا ہے؟ میر صاحب میرے اس سوال سے کچھ پریشان تو ہوگئے، لیکن آدمی چونکہ ذہین ہیں، اس لیے اپنی پریشانی ظاہر نہیں ہونے دی۔ رخصت ہونے سے پہلے میر صاحب نے کہا کہ حکومت پاکستان کے افسر اطلاعات مسٹر اصغر میر بھی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔

میر صاحب کے جانے کے بعد چچا صابر اور میں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ صابر صاحب بوڑھے ہوگئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں لیکن ذہنی طور ان کی تیزی اور طراری میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ واقعات اور افراد کے متعلق ان کے اکثر اندازے صحیح ثابت ہوئے لیکن ان کی ساری سوچ پر مایوسی

اور قنوطیت کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ وہ ہر بات کو بکواس اور ہر شخص کو بیوقوف یا خوش فہم کہہ کر مجھ پر یہ واضح کرنے کی کوشش کرتے، کہ موجودہ صورت حال کا کوئی علاج نہیں۔ ان کے خیال میں ہر وہ شخص جو موجودہ تعطل کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے، بیوقوف ہے یا خوش فہم۔

''میں پوچھتا ہوں کہ تم لوگ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟ تمہیں اس بات کا اندازہ ہے یا نہیں کہ جس مسئلے کے متعلق تم گھنٹوں سر کھپاتے ہو، اس میں تمہاری حیثیت ہے کیا؟ کشمیر کا سوال ہندوستان اور پاکستان ہی نہیں، امریکہ، روس اور اب چین کے درمیان اس طرح الجھا ہوا ہے کہ تمہارا کوئی وجود ہی نہیں، لیکن تم لوگ اس طرح بحث کرتے ہو کہ جیسے تمہاری بحث کے نتیجے پر کشمیر ہی نہیں، ساری دنیا کا دارومدار ہے۔ سب بکواس ہے''۔ صابر صاحب نے میر صاحب اور میری دو گھنٹے کی بحث پر اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ وہ خود میر عبد العزیز کی محاذ رائے شماری سے وابستہ ہیں اور میر صاحب کے متعلق ان کی رائے یہ ہے کہ ''یہ سب سے زیادہ ذہین آدمی ہے، لیکن اتنا ذہین کہ اپنی ذہانت کے منجدھار سے باہر نہیں آسکتا''۔ میں نے پوچھا کہ اگر آپ اس ساری بحث کو بے معنی سمجھتے ہیں تو خود محاذ رائے شماری سے کیوں وابستہ ہیں؟ ''بیٹھے بیٹھے دل گھبرا جاتا ہے اور چونکہ بچپن سے سیاست کا چسکا پڑا ہوا ہے۔ اس لیے کوئی نہ کوئی شغل چاہیے''۔ صابر صاحب نے جواب دیا ''میرا اصل میدان تو صحافت ہے بڑی کوششوں کے بعد بھی یہ شوق پورا نہ ہوسکا۔ اس لیے اب میر عبدالعزیز کے اخبار میں کبھی کبھار اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہوں۔ میں نے چند سال پہلے ایک مضمون لکھا تھا ''یہ میرا گھر نہیں ہے''۔ جس میں، میں نے پاکستان میں مقیم کشمیری مہاجر کے جذبات کی ترجمانی کی تھی۔ ''بہت ہی

اثر انگیز مضمون تھا وہ‘‘ صابر صاحب بہت دیر تک اپنی صحافتی زندگی کے واقعات سناتے رہے کہ کس طرح مہاراجہ ہری سنگھ کے زمانے میں انہوں نے ’’البرق‘‘ کو مسلمانوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔

دوسرے دن صبح منیر احمد ڈار تشریف لائے۔ منیر میرا ہم جماعت اور بچپن کا دوست ہے۔ ہم پہلی سے آٹھویں جماعت تک ساتھ پڑھے ہیں اور اس کے بارے میں مجھے ایک بات اچھی طرح یاد ہے کہ آٹھویں جماعت میں اُسے گاؤں کی ایک لڑکی سے محبت ہوگئی تھی اور وہ مجھ سے اس لڑکی کے نام عشقیہ خطوط لکھواتا تھا، لیکن وہ اتنا محتاط تھا کہ آخری دم تک مجھے اس لڑکی کے نام سے بے خبر رکھا۔ کم بخت کو مجھ پر اعتماد نہ تھا۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ منیر ۵۰ء میں اپنی بہن کے ہمراہ پاکستان آ گیا اور پھر یہیں رہ گیا۔ اپنے ہی گاؤں کی ایک لڑکی سے یہاں اس کی شادی ہوئی اور اب اس کے دو بچے ہیں۔ اور وہ یہیں کہیں سرکاری دفتر میں ملازم ہو گیا ہے۔ ۱۸ برس کے بعد بچپن کے دوست ملے، تو انہوں نے ایک دوسرے کو اتنا بدلا ہوا پایا کہ تھوڑی دیر کے لیے ایک دوسرے کو پہچان بھی نہ سکے۔ خیر خیریت کی رسمی باتوں کے بعد مُنیر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ’’میں اپنے وطن لوٹنا چاہتا ہوں، شمیم صاحب‘‘۔ منیر نے گلوگیر آواز میں کہا۔

’’مگر تم تو اپنی مرضی سے پاکستان آئے تھے اور میرا خیال ہے کہ تمہارے یہاں رہنے کا فیصلہ بھی اپنا ہی تھا‘‘۔ میں نے پوچھا ’’یہ سب صحیح ہے، لیکن اُس وقت مجھے اپنے وطن کی محبت کا اندازہ نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ کچھ دنوں کے لیے رہ جاؤں گا اگر طبیعت نہ لگی تو واپس جاؤں گا۔ لیکن ایک سال کے بعد ہی یہاں میری طبیعت گھبرانے لگی اور آج سترہ سال سے میں ماہی بے آب کی

طرح اپنے وطن کے لیے تڑپ رہا ہوں۔ مجھے اپنے گاؤں کی گلیاں بُری طرح یاد آ رہی ہیں۔ مجھے اپنی ماں اور اپنے بھائی بہنوں کی فرقت نے مار ڈالا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ بے چینی، یہ اضطراب اور یہ بے قراری مجھے پاگل بنا دے گی۔ مجھے پاکستان سے کوئی شکایت نہیں، لیکن میں اپنی اس حماقت پر شرمندہ ہوں کہ میں نے وطن چھوڑ کر ایک اجنبی دیار کو اپنا گھر کیوں بنا لیا، میں واپس آنا چاہتا ہوں اور چوراہوں پر کھڑے ہو کر کشمیریوں کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ خبردار! اپنا وطن چھوڑ کر کہیں جانے کی حماقت نہ کرنا، میری طرح پچھتاؤ گے، کیا آپ میری واپسی کا کوئی بندوبست کر سکتے ہیں۔ کیا آپ وہاں کی حکومت کو یہ یقین دلا سکتے ہیں کہ میں ایک بالکل پُر امن شہری کی طرح رہوں گا کیونکہ میرا سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا''۔ منیر ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گیا۔ مجھے اس کی درد کی شدت کا اندازہ ہو گیا۔ اور میں نے وعدہ کیا کہ میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔ لیکن پاکستان میں اپنے چالیس روز قیام کے دوران مجھ پر یہ حقیقت کھل گئی کہ پاکستان میں ایک ہی منیر نہیں، سترہ ہزار منیر اپنے وطن کی یاد میں تڑپ رہے ہیں۔ میں ایک منیر کے زخموں پر مرہم رکھ کر سترہ ہزار زخموں کا مداوا نہیں کر سکتا۔ میں نے ریاستی اسمبلی میں حکومت کی توجہ اس طرف دلائی تھی اور آج پھر ایک بار میں ارباب اقتدار سے یہ کہنا چاہوں گا کہ جب تک ان سترہ ہزار کشمیریوں کو اپنے وطن لوٹنے کی اجازت نہ دی جائے کشمیر کا مسئلہ حل طلب ہے اور رہے گا۔

مُنیر کے ہمراہ میں راولا ڈیم دیکھنے گیا۔ یہ ڈیم راولپنڈی سے پانچ میل کے فاصلے پر واقع ہے اور اگرچہ وسعت کے لحاظ سے زیادہ بڑا نہیں، تاہم محل وقوع اور افادیت کے لحاظ سے خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ راولپنڈی

سے اکثر لوگ یہاں صبح شام پک نِک منانے کے لیے آتے ہیں۔

شام کو کشفی صاحب کے صاحبزادے مسعود تبسم جو آزاد کشمیر ریڈیو میں کام کرتے ہیں نے چائے پر بلایا تھا۔ وہاں کچھ اور دوستوں سے بھی ملاقات ہوگئی۔ مسعود صاحب کو کشمیری زبان والوں سے دلچسپی ہے اور انہوں نے کشمیری زبان میں لکھنے والوں کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے کشفی صاحب کی کتاب ''ہمارا کشمیر'' کا ایک نسخہ مرحمت فرمایا۔ یہ کتاب ان کی ریڈیو تقاریر کا مجموعہ ہے جو خالصتاً سیاسی پروپیگنڈے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ کچھ دیر بعد ایک اور صاحب تشریف لائے تھے ان کا نام تھا ریاض عشائی۔ شام کو ایک حضرت سے ملاقات ہوگئی اور انہوں نے اپنا نام غلام نبی بتایا۔ یہ حضرت صدائے کشمیر نامی ریڈیو میں کام کرتے ہیں اور ان کے خیال میں کشمیر کو ہندوستان سے آزاد کرانے کا کام صرف صدائے کشمیر ہی پورا کرسکتا ہے۔ میں نے ان کی تعلیمی قابلیت کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ میٹرک میں دوبار فیل ہوگئے ہیں۔ یہ اناؤنسر ہیں (اس ریڈیو میں صرف اناؤنسر ہی اناؤنسر ہے) لکھتے کوئی دوسرے صاحب ہیں، غلام نبی صرف نشر کرتے ہیں۔ حضرت مجھے کافی دلچسپ آدمی دکھائی دئے۔ وہ کچھ اس انداز سے بات کر رہے تھے کہ جیسے پورے پاکستان میں ان کی شخصیت اور اہمیت کا کوئی دوسرا آدمی نہ تھا۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ کشمیر کے کس حصے سے تعلق رکھتے ہیں، تو وہ یوں ٹال گئے کہ جیسے اسی سوال کے جواب میں سارا راز مضمر تھا، اور وہ کسی قیمت پر یہ راز افشا کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

گھر آتے ہوئے جس ٹیکسی میں ہم سوار ہوئے اس ٹیکسی کا ڈرائیور صدر ایوب کا زبردست حامی اور بھٹو کا شدید مخالف تھا۔ صابر صاحب اور

میں دن بھر کی صورت حال پر تبصرہ کر رہے تھے اور ڈرائیور کو ہماری کسی بات سے یہ اندازہ ہو گیا کہ ہم صدر کے حامی ہیں، قطع کلام کرتے ہوئے بولا ''آج سب لوگ صدر ایوب کو گالی دیتے ہیں لیکن آپ دیکھئے کہ ایک دن یہی لوگ اس کو دعائیں دیں گے، ایسا آدمی پاکستان کو نہیں ملے گا۔ اس نے پاکستان کو کیا سے کیا بنا دیا، جگہ جگہ مشینیں ہیں، ہر طرف ترقی ہے۔ خوراک وافر ہے، کپڑا وافر ہے اور کیا چاہیے لوگوں کو؟''

''مگر صدر نے تو کشمیر کا سودا کر دیا ہے اسی لیے سب لوگ اس کے مخالف ہیں''۔ میں نے جلتی پر تیل چھڑکا۔ ''کون بے ایمان کہتا ہے کہ صدر نے سودا کیا ہے۔ یہ تو اس سالے بھٹو نے افواہ پھیلائی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بھٹو تو خود ہندوستان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ آپ نے سنا ہو گا کہ جب نہرو مرا تھا تو بھٹو وہاں پہنچا تھا، اور اخباروں میں اس کی جو فوٹو شائع ہوئی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کا باپ مر گیا ہے اور یہی حال کشمیر کے شیخ عبداللہ کا بھی ہے، مجھے کسی نے سنایا کہ جب نہرو کے مرنے کی خبر آئی تو شیخ عبداللہ مظفر آباد میں تھا اور مرنے کی خبر سنتے ہی وہ بے ہوش ہو گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ میں کہتا ہوں ایسے مسلمان کو گولی مار دینا چاہیے جو کسی کافر کے مرنے پر اس طرح روئے۔

مگر اس کے برعکس صدر کو دیکھئے، پروا نہیں کی اس کافر کے مرنے کی'' ٹیکسی ڈرائیور نے جلال میں آ کر تقریر شروع کر دی اور جب تقریر ختم ہو گئی تو ہم اپنی منزل تک پہنچ چکے تھے۔

9

۲۵ر جنوری کو مسٹر اصغر میر تشریف لائے۔ میر صاحب مغربی پاکستان کے محکمہ اطلاعات میں اطلاعات کے افسر ہیں۔ وہ پونچھ کے رہنے والے ہیں اور ملک کی تقسیم سے قبل ہی راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ پرنسپل انفارمیشن آفیسر حامد جلال صاحب بھی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اصغر میر صاحب کے ہمراہ میں صبح ساڑھے دس بجے قریب پریس انفارمیشن بیورو کے دفتر پر گیا۔ میرے ہمراہ میر عبدالعزیز اور صابر صاحب بھی تھے۔ حامد جلال صاحب نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ باتوں باتوں میں مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جلال صاحب سعادت حسن منٹو (مرحوم) کے بھانجے ہیں۔ منٹو کے متعلق میں نے بہت پہلے ''نقوش'' میں 'منٹو: میرا ماموں' کے عنوان سے ان کا ایک مضمون پڑھا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ کبھی کبھار میرا اخبار ''آئینہ'' پڑھتے ہیں اور ایک اخبار نویس کی حیثیت سے مجھے پاکستان میں ہر وہ سہولیت بہم ہوگی جو دوسرے ملک کے اخبار نویسوں کو حاصل ہوتی ہیں۔ ''اور پھر آپ تو دوسرے ملک کے ہوتے ہوئے بھی اپنے ہی ہیں''۔ حامد جلال نے بڑی محبت اور شفقت سے کہا۔ گھنٹے بھر تک ان سے گفتگو ہوتی رہی۔ زیادہ تر باتیں کشمیر کے متعلق ہوئیں۔ گفتگو کے دوران ایک اور صاحب تشریف لائے، ان کا نام اقبال تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اسی دفتر میں کام کرتے ہیں اور کشمیر پبلسٹی کے انچارج ہیں۔ اقبال صاحب کی آمد سے گفتگو بحث میں بدل گئی اور انہوں نے ایک پیشہ ور پبلسٹی آفیسر کی طرح کشمیر

کے متعلق پاکستانی موقف کو دہرانا شروع کر دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ حامد جلال صاحب کو اقبال صاحب کا یہ انداز پسند نہیں آیا، لیکن وہ آدمی اتنے شریف الطبع، خوش اخلاق اور ملنسار ہیں کہ انہوں نے کچھ نہیں کہا۔

''کیا کشمیر میں کچھ ایسے بھی مسلمان موجود ہیں جو ہندوستان سے الحاق کے حق میں ہیں''۔ اقبال صاحب نے کچھ اس انداز سے پوچھا کہ جیسے اس سوال کا جواب صرف ''نہیں'' ہوسکتا تھا۔ ''جی ہاں بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو ہندوستان سے الحاق کے حق میں ہیں اور ایسے مسلمانوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے جو پاکستان کے ساتھ الحاق کے حق میں نہیں ہیں''۔ میں نے جواب دیا اور اقبال صاحب کی معنی خیز مسکراہٹ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے۔

کچھ دیر تک بڑی دلچسپ باتیں ہوتی رہیں اور میں نے اقبال صاحب کی بہت سی ''غلط فہمیاں'' رفع کرنے کی کوشش کی اور اس کے بعد حامد جلال صاحب سے یہ طے ہوا کہ میں ان سے دوبارہ ملوں گا۔ اور اس دوران میں، میں منگلا ڈیم دیکھ آؤں گا، یہاں سے ہم سیدھے اسلام آباد روانہ ہو گئے۔ جہاں ۱۲ بجے منسٹری آف کشمیر افیئرس کے جوائنٹ سیکریٹری سے ملاقات کا وقت مقرر تھا۔ جوائنٹ سیکریٹری صاحب ایک احسن نام کے بنگالی ہیں۔ کم گو، سنجیدہ اور کچھ شرمیلے سے۔ اصغر میر صاحب سے میرا تعارف کرانے کے بعد صابر صاحب کا تعارف کرایا کہ یہ شمیم صاحب کے چچا ہیں اور بیس سال سے پاکستان میں مقیم ہیں۔

''جناب ہم یہاں یرغمال کے طور رہ رہے ہیں۔ ہمیں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ بندی کا معاہدہ ہونے کے فوراً بعد قیدیوں کے

تبادلے میں یہاں بھیجا گیا تھا ہم سے پوچھے بغیر"۔ صابر صاحب نے جوائنٹ سیکریٹری صاحب سے مخاطب ہو کر کہا اور وہ بے چارے اس قدر شرمندہ ہو گئے کہ ان سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ صابر صاحب کو اتنی دوٹوک بات اس مرحلے پر شاید نہیں کہنا چاہیے تھی۔ لیکن بعد میں انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ایک عرصے سے یہ بات کسی ذمہ دار پاکستانی افسر سے کہنا چاہتے تھے۔ آج پہلی بار موقع ملا، سوانہوں نے موقع ملتے ہی اس کا استعمال کیا۔

احسن صاحب سے کچھ دیر تک کشمیر، ہندوستان اور پاکستان کے متعلق بے ضرر گفتگو ہوتی رہی۔ صابر صاحب کے ایک فقرے نے انہیں بہت محتاط بنا دیا تھا۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ہندوستانی سیاست سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہندوستان میں فیڈرل طرز حکومت کی کامیابی کے امکانات کے متعلق کچھ سوالات پوچھے اور میں نے حتی الامکان انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ وہاں سے فارغ ہو کر میں ہندوستانی ہائی کمیشن پر گیا جو کچھ ہی دوری پر واقع ہے۔ معلوم ہوا کہ نئے ہائی کمشنر صاحب نے ابھی چارج نہیں سنبھالا ہے اور کچھ دن بعد ہی تشریف لانے والے ہیں۔ یہ ہندوستانی سفارت خانوں کی خصوصیت ہے کہ جب بھی کسی ملک میں کوئی غیر معمولی اہمیت کا واقعہ رونما ہوتا ہے تو عین اس وقت ہمارا سفیر یا ہائی کمشنر اس ملک سے غیر حاضر ہوتا ہے۔ پاکستان میں اتنا اہم سیاسی انقلاب رونما ہو رہا تھا اور ہندوستانی ہائی کمیشن بغیر ہائی کمشنر کے تھا۔ ہائی کمشنر کے پریس سیکریٹری مسٹر نریش دیال سے ملاقات ہوئی۔ دیال صاحب سے میں نے دریافت کیا کہ یوم جمہوریہ کی تقریبات پر ہائی کمیشن کی طرف سے کوئی خاص پروگرام ہوگا یا نہیں۔ معلوم ہوا کہ ہائی کمشنر کی عدم موجودگی کی

وجہ سے یوم جمہوریہ کی تقریب صرف جھنڈا لہرانے کی رسم تک محدود رہے گی۔ یہاں سے مایوس ہو کر گھر پہنچے، تو آزاد کشمیر حکومت کے بانی مبانی خواجہ غلام نبی گلکار تشریف فرما تھے۔ گلکار صاحب کو اس بات پر اصرار ہے کہ آزاد کشمیر حکومت کی بنیاد دراصل انہوں نے ہی ڈالی ہے اور وہی اس حکومت کے پہلے سربراہ تھے۔ وہ اپنے ساتھ ان اخبارات کا ایک پشتارہ لے کر آئے تھے کہ جن میں ان کے مضامین شائع ہوئے تھے۔ کہنے لگے ''ان مضامین کو اچھی طرح پڑھ لو، تو خود مختار کشمیر کے متعلق تمہارے سب اندیشے اور وسوسے دور ہو جائیں گے''۔ خود مختار کشمیر کی افادیت سیاسی اہمیت، افادیت اور معقولیت پر ایک زوردار تقریر جھاڑ کر گلکار صاحب نے پوچھا کہ اب ''خود مختار کشمیر کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے''؟ ''اگر پوری ریاست میں دس غلام نبی گلکار بھی پیدا ہو جائیں تو خود مختار کشمیر کا خواب ایک حقیقت بن سکتا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ابھی صرف ایک ہی گلکار پیدا ہوا ہے اور وہ بھی بوڑھاپے کے گھوڑے پر سوار وادی عدم کی جانب روانہ ہے اس لیے......''۔

''گلکار صاحب کو اپنا نام گلکار کی بجائے ''خود مختار'' رکھنا چاہیے'' صابر صاحب نے مذاق کیا۔ اسی اثناء میں عبدالسلام ایتو تشریف لائے، آج شام کو ان کے غریب خانے پر چائے کی دعوت تھی اور وہ مجھے ساتھ لے جانے کے لیے آئے تھے۔

ایتو صاحب کے مکان پر بہت سے کشمیری دوست احباب جمع تھے۔ ان میں اکرم اللہ جسوال، کامریڈ نور محمد، غلام نبی گلکار، ہمدانی صاحب کے نام مجھے اس وقت یاد آرہے ہیں۔ کئی اخبار نویس بھی موجود تھے۔ یوپی کے ایک شیروانی صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ ان کے متعلق بتایا گیا کہ وہ پاکستان

میں مقیم کشمیریوں کے ہمدرد اور دوست ہیں اور مجھ سے ملنے کے لیے لاہور سے آئے ہیں۔

غلام نبی گلکار صاحب نے سب دوستوں کا تعارف ایک مخصوص انداز سے کروایا۔ ان میں سے کچھ لوگ بارہمولہ، کچھ سوپور اور بعض سرینگر کے رہنے والے تھے۔ گفتگو کا سلسلہ شروع ہوگیا اور حاضرین مجلس نے مختلف موضوعات پر مجھ سے سوالات پوچھنے شروع کئے۔ ہر سوال کی تان یہاں آکر ٹوٹتی کہ راستہ کھلنے اور آمد و رفت بحال ہونے کے کیا امکانات ہیں۔ اور میں اس سلسلے میں کیا کرسکتا ہوں؟ پاکستان میں چالیس روزہ قیام کے دوران جب بھی مجھے کشمیریوں کی کسی محفل میں بیٹھنے کا موقعہ ملا۔ زیادہ تر وقت اسی مسئلے پر غور و فکر کرنے میں صرف ہوجاتا کہ راستہ کیونکر کھل سکتا ہے۔ اکثر دوستوں نے مجھ سے کہا کہ جس دن اوڑی سرینگر کا راستہ کھل جائے۔ سمجھ لیجئے کہ کشمیر کا مسئلہ حل ہوگیا۔ ایک کشمیری لیڈر نے مجھ سے سرگوشی کے انداز میں کہا کہ پاکستان اس راستے کو کھولنے کے حق میں نہیں ہے کیونکہ اگر یہ راستہ کھل گیا تو پاکستان کشمیریوں سے خالی ہوجائے گا، میں نے اُسے یقین دلایا کہ ہندوستانی حکومت بھی یہ راستہ کھولنے کے حق میں نہیں ہے کیونکہ وہ بھی بہت سے اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا ہے۔ اس موضوع پر ابھی بات ہو ہی رہی تھی کہ شیروانی صاحب نے قطع کلام کیا۔

''آپ کے خیال میں آزاد اور خود مختار کشمیر کے کیا امکانات ہیں''؟
شیروانی صاحب نے لکھنوی لہجے میں پوچھا ''یہ سوال میں آپ ہی سے پوچھنا چاہتا ہوں'' میں نے ٹال دیا۔

''میرے خیال میں کشمیر کے مسئلے کا صرف یہی ایک آبرومندانہ حل

ہوسکتا ہے''۔ شیروانی صاحب نے کہا ''اور آپ کو یہ سن کر شاید حیرت ہو کہ پاکستان میں بہت سے لوگ اب انہی لائنوں پر سوچنے لگے ہیں، کیونکہ پاکستان کے لوگوں کو اس بات کا شدید احساس ہوتا جارہا ہے کہ پاکستان میں کشمیریوں کے ساتھ مناسب سلوک نہیں ہوا ہے''۔ ''آپ کے خیال میں اس سطح پر سوچنے والوں کی تعداد کتنی ہوگی''؟ میں نے دریافت کیا۔

''حکمرانوں اور لیڈروں میں سے کوئی نہیں، لیکن عام لوگوں میں ان کی تعداد سینکڑوں تک ہوگی''۔ شیروانی صاحب نے کہا۔

اس کے بعد ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کے متعلق بات چل پڑی اور اکثر دوستوں نے اس سلسلے میں گہری تشویش کا اظہار کیا۔ مجھے یہ سن کر تعجب ہوا کہ ۱۹۶۵ء کے بعد ہندوستانی اخبارات میں سے صرف جن سنگھی اخبار آرگنائزر باقاعدگی سے پاکستان آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود پاکستانی اربابِ اختیار اس اخبار کی پاکستان میں درآمد کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں (اور ان کا خیال بالکل صحیح ہے) ہندوستان کے خلاف اس سے زیادہ موثر اور کارگر پروپیگنڈا کوئی دوسری ایجنسی نہیں کرسکتی۔ یہاں سے فراغت پاکر میں صابر صاحب کے ہمراہ محمد یوسف قریشی کے ہاں گیا۔ قریشی صاحب ملک کی تقسیم سے قبل ریاست میں مسلم کانفرنس کے بہت اہم رہنما تھے۔ وہ غالباً سرینگر میں ''ملت'' نام کے اخبار کے ایڈیٹر بھی تھے، لیکن میں نے اس سے پہلے انہیں کبھی دیکھا نہیں تھا۔ وہ پاکستان میں مقیم کشمیریوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ عیدگاہ کے قریب انہیں ایک بہت بڑی کوٹھی الاٹ ہوئی ہے۔ اور وہ آج کل عملی سیاست سے کچھ دور گوشۂ عافیت میں پناہ گزین نظر آتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ

آزاد کشمیر کے سیاسی دلدل میں کچھ ایسے دھکے کھائے کہ مولانا محمد سعید مسعودی کی طرح گوشہ نشین ہو گئے۔

قریشی صاحب کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ بہت اچھے مقرر اور خطیب ہیں۔ ان کے لب و لہجے اور طرز بیان میں ایک ایسی دلکشی تھی کہ میں چاہتا تھا کہ وہ بولتے جائیں اور میں سنتا جاؤں۔ صابر صاحب نے میرا تعارف کر دیا، تو وہ بولے ''تعارف کی ضرورت نہیں، میں انہیں جانتا ہوں''۔ مجھے قدرے حیرت ہوئی کیونکہ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ انہوں نے میری حیرت کو بھانپتے ہوئے کہا کہ ''ایک دو بار آپ کا اخبار پڑھا ہے اور میں آپ کو جان گیا ہوں اور آج جو دو ایک باتیں آپ سے کروں گا وہ اسی ناطے کروں گا، ورنہ اب کسی سے بات کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا''۔ اس کے بعد قریشی صاحب نے بڑے موثر انداز میں اپنی روداد سنائی۔ الفاظ کا ایک دریا تھا جو بہہ رہا تھا۔ جذبات سے پُر اور درد سے لبریز!

''آپ نے شاید سنا ہو کہ پاکستان بننے سے پہلے میں نے بھی پاکستان بنانے کے لیے ایک حقیر سی جدوجہد کی ہے۔ میرے دل میں آج بھی پاکستان کے لیے بے پناہ محبت اور خیر سگالی کا جذبہ ہے، لیکن پاکستان میں بیس سال رہنے کے بعد اب میں اپنے وطن لوٹنا چاہتا ہوں۔ اس ملک میں ہمیں بڑی بڑی کوٹھیاں اور جائیدادیں ملیں۔ جس کے پاس کٹیا بھی نہ تھی وہ آج یہاں محلوں میں رہ رہا ہے۔ یہ میری کوٹھی دیکھ لیجئے، لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے سے کم نہ ہوگی۔ موٹر بھی ہے میرے پاس اور زمین بھی۔ سب کچھ ملا لیکن عزت نہ ملی۔ اپنے وطن میں کچھ بھی نہ تھا لیکن عزت بڑی تھی۔ شیخ صاحب جب ۶۴ء میں یہاں آئے تھے، تو میں نے ان سے صرف ایک ہی

بات کہی تھی کہ کسی طور ہمارے گھر لوٹنے کا بندوبست کیجئے۔ انہوں نے اس دن بڑی تسلی دی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھول گئے۔ آپ انہیں جاتے ہی یاد دلائیے۔ صادق صاحب کو بھی میرا اسلام دیجئے۔ ان سے کہیے کہ میں کشمیر آکر سیاست لڑانا نہیں چاہتا۔ کسی تنگ و تاریک کوٹھری میں گمنامی کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جب صادق صاحب ایمرجنسی ایڈمنسٹریشن کا ایک حصہ تھے، تو انہوں نے امیرا کدل پار کرتے ہوئے مجھے سلام کیا تھا۔ میں نے اس کے جواب میں انہیں گالی دی تھی۔ وہ محمد یوسف قریشی اب مر گیا۔ جذبات میں اب وہ انتہا پسندی نہ رہی ہے۔ اب عمر کی ایک ایسی منزل پر پہنچ گیا ہوں کہ دوسرے کا نکتہ نظر سننے کی ہمت اور صلاحیت بھی پیدا ہو گئی ہے''۔

''افسوس اس بات کا ہے کہ آپ مفتی ضیاء الدین پونچھ والے سے واقف نہیں۔ وہ بڑے ہی دلچسپ، جرات مند اور باغیرت کشمیری تھے۔ بے چارے بڑی کسمپرسی کی حالت میں مر گئے۔ جب صدر ایوب نے کشمیریوں کا وظیفہ بند کر دیا، تو مفتی ضیاء الدین نے مجھ سے کہا کہ قریشی صاحب بارہ کروڑ مسلمانوں میں سے کسی نے یہ آواز بلند نہیں کی کہ مفتی ضیاء الدین زندہ کیسے رہے گا''۔

''مولانا مسعودی صاحب سے میرا اسلام کہیے گا۔ ان سے کہیے کہ یوسف قریشی کے ڈرائنگ روم میں ان کی تصویر قائداعظم علی محمد جناح کی تصویر کے اوپر لگی ہوئی ہے۔ میں صرف مولانا کی دیانت اور سیاسی سوجھ بوجھ کا قائل ہوں، باقی مجھے سبھی سے شکایت ہے''۔

''آپ یقین کریں گے کہ اُس پاکستان میں، جس کی تعمیر اور تخلیق میں،

میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ صرف کیا۔ مجھ پر بھی سی آئی ڈی کا عملہ تعینات رہا ہے؟ یہاں میرے مکان کے باہر سی آئی ڈی والے میرے عزیزوں سے یہ پوچھتے رہتے ہیں کہ بتاؤ یوسف قریشی اندر بیٹھا کیا کر رہا ہے''۔قریشی صاحب ایک گھنٹے تک باتیں کرتے رہے اور میں ہمہ تن گوش ہو کر سنتا رہا۔ان کی کچھ ہی باتیں مجھے یاد رہ گئیں اور کچھ ایسی ہیں کہ جو ناگفتنی ہیں۔رخصت ہونے سے قبل انہوں نے ایک بار مجھے یاد دلایا کہ وہ پاکستان میں اپنی ساری زمین جائیداد چھوڑ کر کشمیر لوٹنے کے لیے تیار ہیں۔ بشرطیکہ انہیں یہاں آنے کی اجازت دی جائے۔ میں قریشی صاحب سے دوبارہ ملاقات کا وعدہ کر کے رخصت ہوا اور میر عبدالعزیز کے ہاں پہنچ گیا۔ یہاں اخبار نویسوں کی طرف سے ایک دعوتِ عصرانہ کا اہتمام کیا گیا تھا اور اس میں محکمہ اطلاعات کے کچھ افسر بھی شامل تھے۔ کچھ دیر تک رسمی باتیں ہوتی رہیں اور فیصلہ یہ ہوا کہ اس گفتگو کے متعلق اخبارات میں کوئی خبر شائع نہ ہوگی (اگرچہ دوسرے دن ''پنڈی میل'' نامی اخبار میں گفتگو کے کچھ حصے توڑ مروڑ کے شائع ہوئے تھے)۔

شام کو گھر پہنچا، تو میرے دو چچا زاد بھائی غلام محی الدین اور فاروق ایبٹ آباد اور پشاور سے مجھے ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔غلام محی الدین میرا ہم عمر اور میرے بچپن کا ساتھی ہے۔ ۱۸ر برس کے بعد اس سے مل کر بچپن کی کتنی ہی یادیں، حسین اور شوخ یادیں تازہ ہوگئیں۔اور ہم ساری دنیا کو بھول کر کچھ دیر کے لیے ماضی میں کھو گئے، غلام محی الدین نے مجھے وہ بہت سی باتیں یاد دلائیں، جو میرے ذہن سے اُتر گئی تھیں۔ایک بار ہم نے گھر سے ایک بوری شالی چرا کر اپنے ایک ایسے دوست کے گھر پہنچائی تھی جو کئی

دنوں سے بھوکا تھا۔ ۱۸؍ برس بعد ہم نے چچا صابر کے سامنے اپنی اس چوری کا اعتراف کیا۔ فاروق اب فوج میں سیکنڈ لیفٹننٹ ہے۔ ۱۹؍ برس قبل جب وہ یہاں سے گیا تھا تو تین سال کا بچہ تھا اور اس نے میرے بارے میں سنا تھا اور اب جو مجھے دیکھا، تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اور میری نگاہوں میں وہ انگوٹھا چوسنے والا فاروق پھرنے لگا جو اب فوج میں افسر ہو گیا ہے۔

10

میرے چچا مشتاق احمد کا پہلا نام استغفر اللہ تھا اور یہ نام دادا مرحوم (مولوی عبد اللہ وکیل) نے تجویز کیا تھا جو لوگ مشتاق صاحب کو جانتے ہیں ان کے خیال میں استغفر اللہ سے بہتر اور موزوں نام ان کے لیے ممکن نہ تھا، لیکن ان کی سیمابی فطرت صرف ایک نام پر کیسے قانع ہو سکتی تھی، وہ پہلے مشتاق احمد ہو گئے۔ پھر ایم۔ اے فاروقی اور اب پاکستان بھر میں فاروق کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ مولوی صاحب کی آخری اولاد ہیں اور ان کے بارے میں مجھے صرف یہ معلوم ہے کہ وہ نہایت سخت قسم کے مسلم لیگی اور بے حد جوشیلے نوجوان تھے۔ ان کی ذہانت، شوخی اور طراری کا بڑا شہرہ تھا اور اکثر لوگ انہیں ''فتنہ'' کے نام سے پکارتے تھے۔ میں ان دنوں شوپیان میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا اور والد صاحب اکثر چھوٹے بھائی کی تیزی و طراری کے قصے سنایا کرتے تھے۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ رات کے نو بجے ہمارے دروازے پر کسی نے پُر اسرار طور پر دستک دی۔ دروازہ کھلا تو مشتاق صاحب اندر آ گئے۔ وہ کچھ سہمے سہمے سے تھے۔ انکی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ ان کی آنکھوں سے خوف اور سراسیمگی ٹپک رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی شخص ان کا پیچھا کر رہا ہے۔ والد صاحب نے ان سے پوچھا کہ وہ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟

''پولیس میرا پیچھا کر رہی ہے اور مجھے آج ہی رات کو یہاں سے نکلنا ہوگا''۔ چچا مشتاق نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''تم جا کہاں رہے ہو''؟ والد صاحب نے پوچھا۔

’’میں پاکستان جارہا ہوں اور مجھے کل دن کے اندر اندر سرحد پار کرنا ہوگی‘‘۔ اُنہوں نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد والد صاحب اور چچا جان میں بڑی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ والد صاحب نے انہیں اپنا ارادہ بدلنے پر بہت مجبور کیا۔ لیکن ان کا ارادہ اٹل تھا۔ وہ کسی قیمت پر بھی اس ’آزادی‘ کی جنگ میں شریک ہونا چاہتے تھے، جوان کے لیے جہاد کا درجہ رکھتی تھی، مجھے ان کا وہ فقرہ ابھی تک یاد ہے کہ جوانہوں نے والد صاحب سے مخاطب ہوکر کہا تھا۔ ’’بھائی صاحب! آپ کوتو عبداللہ (شیخ محمد عبداللہ) نے گمراہ کردیا ہے لیکن میری بے چین روح کوتب تک قرار نہیں ملے گا، جب تک ہر مندر پر اسلام کا جھنڈا لہراتا ہوا نظر نہ آئے، میں جارہا ہوں۔ خدا حافظ‘‘۔ یہ مشتاق چچا سے میری پہلی اور ۲۰ سال تک آخری ملاقات تھی۔ پھر وہ رات کی تنہائیوں میں کھوگئے اور کچھ دنوں بعد اطلاع آگئی کہ وہ بخیر وعافیت پاکستان پہنچ گئے ہیں! راولپنڈی پہنچتے ہی میں نے مشتاق صاحب کو خط لکھا کہ وہ مظفرآباد میں ہی میرا انتظار کریں۔ میں وہی پہنچ جاؤں گا لیکن میرا خط ملنے سے پہلے ہی انہوں نے روزنامہ ’جنگ‘‘ میں میری آمد کی خبر پڑھ کر راولپنڈی کا راستہ لیا۔ اور جب وہ شام کو گھر پہنچے تو میں مولوی عبدالغفار (سابق ایڈیٹر اصلاح) کی صاحبزادی کی شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا۔ اس رات ہم بہت دیر سے لوٹے اور معلوم ہوا کہ مشتاق صاحب تشریف لائے ہیں۔ لیکن کہیں اور ٹھہرے ہوئے ہیں اور کل علی الصبح آنے والے ہیں۔ رات بہت دیر تک میں بیس برس پرانی ملاقات کے دھندلے سے نقوش میں رنگ بھرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن بے سود، ذہن میں ان کی کوئی تصویر نہ اُبھر سکی۔ اتفاق سے صابر صاحب کے ہاں ان کی کوئی تصویر بھی نہ تھی، کہ جسے دیکھ کر میں

ان کے خدوخال کا اندازہ کر سکتا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح فاروق صاحب (پاکستان میں لوگ مشتاق صاحب کو اسی نام سے جانتے ہیں) تشریف لائے۔ ان کے ساتھ کوئی علوی صاحب بھی تھے۔ میں نے فاروق صاحب کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ان بیس برسوں میں کچھ زیادہ نہیں بدلے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں، میں نے آج بھی وہ وحشت اور سراسیمگی دیکھی، جو میں نے آج سے بیس برس پہلے اس برفانی رات کو دیکھی تھی، جب وہ رات کی تنہائیوں میں وطن چھوڑ کر اپنے خوابوں کی جنت کی طرف جا رہے تھے۔

وہ کچھ بے چین، مضطرب اور پریشان سے دکھائی دے رہے تھے۔ صابر صاحب کی موجودگی میں، زیادہ تر رسمی باتیں ہوتی رہیں۔ لیکن جونہی صابر صاحب کسی کام سے باہر نکلے، فاروق صاحب نے میری طرف کاغذ کا ایک پرچہ بڑھاتے ہوئے کہا "اسے پڑھ لو" میں نے اسے پڑھ کر فوراً ہی پھاڑ ڈالا، کیونکہ کاغذ پر درج تحریر کے آخر میں یہ ہدایت درج تھی کہ اسے پڑھتے ہی پھاڑ ڈالئے!

فاروق صاحب مجھ سے الگ بات کرنا چاہتے تھے، انہیں اپنے بھائی صابر صاحب پر بھی اعتماد نہیں تھا، انہیں ہر دوسرا تیسرا آدمی سی۔ آئی۔ ڈی والا نظر آتا تھا اور انہیں یہ وہم تھا کہ میں خفیہ پولیس کے آدمیوں سے گھرا ہوا ہوں۔ یہ سب کچھ ان کا وہم تھا، لیکن یہ وہم بے جا نہ تھا۔ پاکستان میں اُن کی زندگی کے بیس سال ایک مسلسل جنگ میں صرف ہوئے ہیں۔ وہ کئی بار جیل گئے ہیں۔ ان پر مقدمے چلے ہیں۔ ان کے مکان کی تلاشیاں لی گئی ہیں اور ان کی وفاداری پر ایک بار نہیں کئی بار شک کیا گیا ہے۔ اسی لیے انہیں کسی شخص

پر بھی اعتماد نہیں رہا ہے۔ اپنے بھائیوں پر بھی نہیں!

فاروق صاحب نے اپنے ساتھی علوی کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ علوی صاحب محاذ رائے شماری کے سیکرٹری ہیں۔ یہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران یہاں آ گئے اور یہ میرے بہترین دوست ہیں۔

کچھ دیر بعد ہم گھر سے چل دئے اور ایک ہوٹل میں پہنچ گئے۔ ہوٹل میں محاذ رائے شماری کے اور بھی کئی کارکن موجود تھے اور فاروق صاحب نے ایک ایک کر کے مجھے سب سے متعارف کرا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے اپنی روداد سنانا شروع کر دی۔ ان کی کہانی لکھنے بیٹھوں تو ایک پوری کتاب بن جائے گی، اس لیے صرف چند اقتباسات پیش کروں گا لیکن انہی کے الفاظ میں:

''میں کالج کے زمانے میں بھی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا سیکرٹری اور روح رواں تھا، پھر کچھ دنوں کے لیے سرینگر میں خاکسار تحریک چلائی۔ ان دنوں میں اپنی ترکی ٹوپی پر ''اخوت'' کا بیج لگا کر بازاوں میں گھومتا اور جگہ جگہ نیشنلسٹوں کے ساتھ مباحثے کرتا تھا، ۱۹۴۶ء کے اوائل میں چارسدہ، مانکی اور چند قبائلی علاقوں کا دورہ کر کے قبائلی حملے کے لیے زمین ہموار کی اور پھر جب ۱۹۴۷ء میں قبائلیوں نے حملہ کیا، تو میں نے اپنے چند ساتھیوں سمیت اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ ہم لوگوں نے شہر میں دو ایک پل جلانے کی بھی ناکام کوشش کی۔ انہی دنوں نیشنل ملیشیا کے میجر افضل نے دو سو آدمی لے کر گاؤ کدل کے قریب مجھ پر حملہ کیا اور مجھے بری طرح زدوکوب کیا۔ پھر افضل بری طرح مجھے مار رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ گالیاں دیتا جا رہا تھا۔ جب اُس نے ایک گھونسہ رسید کرتے ہوئے مجھے سُسرے کہا تو میرے منہ سے بے اختیار نکلا کہ میجر صاحب ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔ ''تو پھر سالے''، میجر افضل نے

ایک اور طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا۔

''پھر رات کی تاریکیوں میں شوپیان سے روانہ ہو کر پوشن، ڈوگریاں، سرن کوٹ، وھرمسال، جھنگڑ، ہجیرہ اور تراڑ کھل سے ہوتا ہوا پاکستان پہنچا۔ شوپیان سے روانہ ہونے سے پہلے بھائی صاحب (میرے والد) نے بڑی منت سماجت کی تھی کہ تم نہ جاؤ، پچھتاؤ گے، لیکن مجھ پر جنوں طاری تھا اور جب میں نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا، تو میرے تھکے ہوئے جسم میں ایک نئی روح عود کر آئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہر زخم پر کسی کے نرم ہاتھوں نے کوئی مرہم رکھ دیا ہو۔ میں دل و جان سے کشمیر کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں شریک ہو گیا اور یہ غالباً ۱۹۵۱ء یا ۵۲ء کا واقعہ ہے کہ میں نے کشمیر جا کر شیخ عبداللہ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ خوش قسمتی سے یہ منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا اور مجھ پر کچھ نہایت ہی ناگوار، تلخ اور صبر آزما حقیقتیں واضح ہونے لگیں، پاکستان سے بے پناہ جذباتی لگاؤ کے باوجود میں کشمیر سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور ان بیس برسوں میں اس محبت میں کئی ہزار گنا اضافہ ہوا ہے لیکن پاکستان میں مجھے سب سے پہلے جس احساس نے چونکا دیا، وہ تھا پاکستانی حکمرانوں کا کشمیر کے تیئں رویہ۔ انہیں کشمیر کی آزادی سے نہیں، کشمیر کے حصول سے زیادہ دلچسپی تھی۔ میں نے اور میری ہی طرح بہت سے دوسرے کشمیریوں کو اس رویے اور انداز فکر سے بڑی مایوسی ہوئی اور یہی مایوسی ہماری بہت سی مایوسیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی''۔

''گذشتہ بائیس برسوں میں مصائب کا کوئی ایسا پہاڑ نہیں جو مجھ پر نہ ٹوٹا ہو۔ مجھے کئی بار گرفتار کیا گیا۔ پاکستان سیکورٹی ایکٹ کے تحت، یعنی مجھے 'مشتاق' کو پاکستان کی سیکورٹی کے لیے خطرہ سمجھ کر گرفتار کیا گیا۔ پاکستانی

حکمرانوں نے یہ بھلا دیا کہ میں پاکستان کی خاطر اپنی زندگی پر کھیل کر پاکستان آیا ہوں۔ کئی بار میرے گھر کی تلاشی لی گئی، اور میرے سارے کاغذات ضبط کر دئے گئے۔ مجھ پر سیاسی ہی نہیں اخلاقی بے راہ روی کے الزام میں مقدمے چلائے گئے۔ جھوٹے گواہ پیش کئے گئے۔ پولیس نے اپنا سارا زور صرف کر دیا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں باعزت بری کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ میں ان پاکستانی حکمرانوں اور ان سیاستدانوں کے خلاف تھا، جو کشمیر کی شخصیت، اس کی انفرادیت اور اس کی اپنی حیثیت کو ختم کر کے اسے ہر قیمت پر پاکستان کا حصہ بنانا چاہتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ پنجابی مسلمان، کشمیریوں کی بجائے جموی مسلمانوں کو اپنے قریب سمجھتا تھا اور چوہدری غلام عباس (مرحوم) نے میرے اس احساس کو اور زیادہ تقویت پہنچائی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کشمیر کی تہذیب، ثقافت اور تمدن کو ختم کرانے کے لیے ایک خاموش سازش منظّم کی گئی ہے اور مرحوم عباس نے چن چن کران کشمیریوں کو تکلیفیں دینا شروع کر دیں، جو پاکستان میں رہ کر بھی کشمیر کی انفرادیت، اور تمدن کو زندہ جاوید رکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے مرحوم سے میری کبھی نہ بن سکی۔"

"تم یہ نہ سمجھو کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں۔ اس میں صرف میری ذاتی محرومیوں یا پریشانیوں کو ہی دخل ہے، جو کچھ میں تم سے کہہ رہا ہوں، یہ مجھ سے زیادہ معتبر، بزرگ اور مستند لوگ بھی کہہ چکے ہیں۔ وہ لوگ بھی جو آزاد کشمیر کے صدر رہ چکے ہیں۔ اے کاش! تم اس وقت آتے جب میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ زندہ تھے۔ تم ان کی زبانی میرے خیالات کی تصدیق کر سکتے تھے۔ تم سردار ابراہیم اور کے۔ ایچ۔ خورشید سے ملو گے، تو تمہیں میری باتوں کا یقین آجائے گا"۔

''شیخ صاحب تک میرا اسلام پہنچا دینا۔ ان سے کہہ دینا کہ زمانے اور تجربے نے ہمیں غلط ثابت کر دیا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے اپنی زندگی کا ایک حصہ ان کی اندھی مخالفت میں گذارا، انکی نظر بہت دور تھی، ہم آج ان کو اور صرف ان کو اپنا قائد مانتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ۱۹۶۴ء میں ان کے دورۂ پاکستان کے وقت پاکستانی اربابِ اختیار نے مجھے، غلام نبی گلکار اور عبدالخالق انصاری کو ان سے ملنے نہیں دیا''۔

''میر عبدالعزیز نے تمہیں محاذ رائے شماری میں تفرقے کا قصہ سنایا ہوگا۔ یہ آدمی بڑا مفتن ہے، اس سے بچ کے رہنا، میرا بڑا ہی قریبی دوست رہ چکا ہے۔ لیکن یہ شخص جدوجہد میں تھک کر ہار گیا ہے اور اب اس نے سمجھوتے کرنا شروع کر دئے ہیں اور اسی لیے میں نے اس قطع تعلق کر لیا ہے''۔

مشتاق صاحب نے پہلی ہی ملاقات میں اتنی باتیں کیں کہ میں سنتے سنتے تھک گیا۔ وہ بے تکان بولتے چلے جا رہے تھے۔ کبھی سرگوشیوں میں اور کبھی بآوازِ بلند۔ دو گھنٹے کی اس یک طرفہ گفتگو میں انہوں نے ایک بار بھی مجھ سے میری والدہ یا بہنوں کی خبر خیریت کا احوال تو کیا، اپنی بہن کے بارے میں بھی کچھ نہ پوچھا۔ وہ سیاست میں اس درجہ غرق ہیں کہ ان کے لیے انسانی رشتے ناطے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ وہ بے حد ذہین، ظریف اور ذکی الحس آدمی ہیں۔ ان کی ذہانت ان کے لیے زادِ راہ کی بجائے سدِ راہ ثابت ہوگئی ہے اور اکثر لوگ اس سے خائف ہو کر ان سے دور رہنے یا ان کو دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی زبان بہت تیز اور ان کا ذہن بہت تیز رفتار ہے۔ وہ بہترین ہزل گو، طنز نگار اور ایک اچھے صحافی ہیں۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ وہ اپنی بے پناہ خداداد صلاحیتوں سے

کوئی تعمیری کام نہیں لے سکے ہیں۔ ان سے مل کر مجھے ایک شدید اور گہرے المیے کا احساس ہو گیا۔ پاکستان اور آزاد کشمیر میں ان سے بہت کم درجے کی ذہانت اور صلاحیت والے لوگ بڑے بڑے منصبوں پر فائز ہیں لیکن مشتاق صاحب جیسے لوگ پاکستانی سیاست کے چوکھٹے میں فٹ نہ آنے کی وجہ سے ابھی وہیں ہیں، جہاں سے انہوں نے بیس برس پہلے شروع کیا تھا، وہ آج کل مظفر آباد میں وکالت کر رہے ہیں، لیکن وکالت سے زیادہ سیاست میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں بے مقصد اور بے معنی سیاست میں!

دن کو مولوی عبد الغفار کے ہاں ان کی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں اہل کشمیر کا ایک بہت بڑا اجتماع موجود تھا۔ بہت سے لوگ آزاد کشمیر ریڈیو (واقع راولپنڈی) سے وابستہ تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ "آئینہ" بڑے شوق سے پڑھتے ہیں اور اکثر اس کے صفحوں کے صفحے ریڈیو سے نشر کرتے ہیں۔ میں نے امید ظاہر کی کہ پاکستان کے متعلق میرے سفر نامے کو بھی ریڈیو آزاد کشمیر سے نشر کر دیا جائے گا۔

ثناء اللہ شمیم اور غلام الدین صاحب بھی موجود تھے۔ یہ دونوں بزرگ آزاد کشمیر میں وزیر رہ چکے ہیں اور اب راولپنڈی میں وکالت کرتے ہیں۔

شمیم صاحب نے شکایت کی، کہ ہندوستانی حکومت کی طرف سے پاکستان میں مقیم کشمیریوں کو کشمیر آنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ شمیم صاحب کے خیال میں ہندوستانی حکومت ہر مسلمان کو پاکستان کا وفادار تصور کر کے اس پر شک کرتی ہے اور اسی لیے کشمیری مسلمانوں کو وطن جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ میں نے اس خیال سے اتفاق کرتے ہوئے شمیم صاجب سے کہا کہ کشمیریوں کی وفاداری پر صرف ہندوستان شک کرتا، تو کسی حد تک بات سمجھ

میں آسکتی تھی لیکن یہاں آکر مجھے یہ محسوس ہوا کہ پاکستان میں بھی ان کی وفاداری مشکوک ہے۔آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہے؟''اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ملک کو اپنی سلامتی کا خیال مقدم رکھنا پڑتا ہے اور پاکستان میں بھی ایسے کشمیری موجود ہیں کہ جن کی وفاداری مشکوک ہو سکتی ہے''۔ شمیم صاحب نے وضاحت کی۔

''یہی بات ہندوستان اپنے حق میں بھی استعمال کر سکتا ہے اور اسی لیے پاکستان اور آزاد کشمیر میں مقیم کشمیریوں کو وطن لوٹنے کی اجازت نہیں دی جاتی''۔ میں نے کہا اور ساتھ ہی ان لوگوں کو یقین دلایا کہ کشمیر لوٹتے ہی میں ریاستی حکومت اور مرکزی حکومت پر زور دوں گا کہ وہ وطن لوٹنے کے خواہشمند لوگوں کو بغیر کسی اُلجھن اور دِقت کے کشمیر آنے کی اجازت دے دیں۔ چار بجے کے قریب میں گھر لوٹا، تو معلوم ہوا کہ میر پور سے عبد الخالق انصاری تشریف لائے ہیں۔ انصاری صاحب محاذ رائے شماری (لامحدود) کے صدر ہیں اور میر پور میں وکالت کرتے ہیں۔ان کا نام بلراج پوری اور وید بھسین کی زبانی سنا تھا۔ یہ دونوں تقسیم سے پہلے کالج میں ایک دوسرے کے ہم عصر اور دوست تھے۔انصاری صاحب راجہ محمد اکبر خان صاحب (میر پور والے) کے زیر اثر نیشلسٹ تحریک میں شامل ہوئے تھے اور پاکستان میں بیس سالہ قیام کے بعد بھی طرز فکر اور کردار کے اعتبار سے قوم پرست ہی ہیں۔ان کا شمار بھی ان باغیوں میں ہوتا ہے جو جموں اور کشمیر کو ایک تہذیبی، سیاسی اور تاریخی اکائی سمجھ کر اس کی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے حق میں ہیں۔ انہیں یہ شکایت ہے کہ شیخ صاحب اور بیگ صاحب اکثر کشمیر کی بات کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں صرف وادی کا تصور ہے، پوری ریاست کا نہیں۔

انصاری صاحب نے تفصیل کے ساتھ میر عبدالعزیز سے اپنے اختلافات کا ذکر کیا اور کہا کہ محاذ رائے شماری کی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی ذمہ داری صرف اس شخص پر ہے۔ اُنہوں نے مجھے دعوت دی کہ میں میرپور جا کر ۱۹۶۵ء کے پناہ گزینوں کے جلسے میں شرکت کروں۔ میں نے یہ کہہ کر معذوری ظاہر کی کہ میں یہاں کسی قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے سکتا۔ انصاری صاحب بڑے مخلص اور معصوم آدمی ہیں۔ کہنے لگے کہ اپنے بھائی بندوں سے ملنے ملانے میں کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آخر ہم سب لوگ ایک ہی ریاست کے باشندے ہیں۔ بالآخر میں نے انہیں اس بات پر راضی کر لیا کہ جلسے یا جلوس میں شریک ہونا میرے لیے مناسب نہ ہوگا۔ انصاری صاحب نے پچھلے سال ایک تحقیقاتی عدالت کے سامنے بیان دیتے ہوئے آزاد کشمیر میں بدنظمی اور لاقانونیت سے متعلق کچھ اہم انکشافات کئے تھے اور حکومتِ پاکستان کو اس امر کی طرف توجہ دلائی تھی کہ آزاد کشمیر میں سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ انصاری صاحب کے اس بیان پر پاکستانی اخبارات اور سیاسی حلقوں میں خاصی لے دے ہوئی تھی۔ شام آٹھ بجے کے قریب انصاری صاحب کو رخصت کر کے جب میں گھر لوٹا تو صابر صاحب نے یہ ''خوشخبری'' سنائی کہ مولوی عبدالغفار کے ہاں شادی پر کسی خوش بخت نے ان کی جیب کاٹ کر ایک ہزار روپے کی رقم اڑا لی ہے۔

11

پاکستان کے طول وعرض میں مظاہروں کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔تشدد کے واقعات میں آئے دن اضافہ ہوتا جارہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پاکستانی عوام صدر ایوب کی آمریت کو ختم کرنے کے لیے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔صدر کے حامیوں اور سرکاری مسلم لیگ کے لیڈروں کے خلاف بھی نفرت کا لاوا پھوٹ پڑا تھا اور وہی لوگ جو صرف چند ماہ پہلے محترم اور معزز سمجھے جاتے تھے۔آج عوامی نفرت اور غیض وغضب کا مرکز بنے ہوئے تھے۔مشرقی پاکستان میں تو وزیروں کے گھر تک جلا دئے گئے۔مغربی پاکستان میں صدر کے ساتھیوں نے ایک ایک کرکے ان کے خلاف بیانات دینا شروع کردئے۔ڈھاکہ میں مجیب الرحمان کے خلاف اگر تالہ سازش کیس کی سماعت کرنے والے جسٹس محمود الرحمٰن کے گھر پر بلوائیوں نے دھاوا بول دیا اور اگر انہیں ان کا ہندو نوکر پچھلے دروازے سے باہر نہ نکالتا، تو نہ معلوم بلوائی ان کا کیا حشر کردیتے۔جسٹس رحمان اور ان کے بیوی بچے ننگے سر ڈھاکہ سے لاہور کے ہوائی اڈے پر اُترے۔انہی دنوں ذوالفقار علی بھٹو جن کی نظربندی کے خلاف رٹ پیٹشن کی سماعت بوسٹل جیل لاہور میں ہو رہی تھی، نے عدالت عالیہ کے سامنے اپنا ایک طویل بیانِ حلفی پیش کیا جس میں انہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ صدر ایوب کے خلاف اپنے اختلافات کا پس منظر بیان کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ صدر اور ان کے درمیان اختلافات کا آغاز معاہدہ تاشقند پر دستخط ہونے کے فوراً بعد ہی ہوتا

ہے۔ مسٹر بھٹو نے بیانِ حلفی میں اپنے سارے سیاسی فلسفے کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا تھا اور اس میں انہوں نے صدر پر بڑے شدید الزامات عائد کئے تھے۔ یہ بیانِ حلفی ایک سیاسی دستاویز ہونے کے ساتھ ساتھ مسٹر بھٹو کی بے پناہ ذہانت اور غیر معمولی قوتِ تحریر کا نا قابلِ تردید ثبوت ہے۔ اس بیان حلفی کو پاکستانی اخبارات نے من وعن شائع کر دیا اور سرکاری اخبار پاکستان ٹائمز کو بھی اسے شائع کرنا ہی پڑا۔ اس میں کشمیر اور چین کے متعلق صدر کی پالیسی کے خلاف بھی شدید نکتہ چینی کی گئی تھی، لیکن سرکاری وکیل کے مطالبے پر عدالت نے ان حصوں کی اشاعت روک دی۔ عدالت کے سامنے یہ بیان حلفی پیش ہونے کے دوسرے تیسرے دن ہائی کورٹ نے حکم دیا کہ مسٹر بھٹو کو بوسٹل جیل سے منتقل کر کے اپنے گھر لڑکانہ میں نظر بند کر دیا جائے۔ یہ ایک عجیب وغریب حکم تھا، لیکن پاکستان میں اس وقت اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب باتیں ہو رہی تھیں۔ اس لیے ہائی کورٹ کے اس نیم سیاسی حکم کے عجوبے پن پر کسی کو سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ مسٹر بھٹو کو ہوائی جہاز کے ذریعے لاہور سے لڑکانہ پہنچانے کی پیشکش کی گئی، لیکن وہ ہوائی جہاز سے سفر کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ ہوائی جہاز میں ان کو مار ڈالنے کی سازش منظم کی گئی ہے اس لیے وہ ریل سے لڑکانہ پہنچا دیے گئے۔

۲۷ / جنوری کے پاکستان ٹائمز میں یہ خبر شائع ہوگئی کہ صدر مخالف جماعتوں سے بات چیت کرنے پر آمادہ ہیں اور وہ عنقریب ہی مجلس عمل کے نمائندوں کو بات چیت کی دعوت دیں گے۔ پاکستان ٹائمز چونکہ صدر کا ترجمان تھا، اس لیے اس خبر کو پاکستان بھر میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگئی اور لوگ بڑی بے صبری کے ساتھ صدر کے آیندہ اقدام کا انتظار کرنے لگے۔ پاکستان

ٹائمز نے دوسرے دن یہ خبر بھی شائع کی کہ غالباً صدر یکم فروری کو قوم کے نام اپنی ماہانہ نشری تقریر میں حزب مخالف کے لیڈروں کو بات چیت کی دعوت دیں گے۔ اس اعلان سے صاف ظاہر تھا کہ صدر کی پوزیشن روز بروز کمزور ہوتی جارہی ہے اور وہ اپنے ذاتی وقار کی پرواہ کئے بغیر اب اپنے مخالفوں کو رعایتیں دینے پر آمادہ ہوگئے ہیں لیکن پاکستانی عوام کے موڈ سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی قیمت پر صدر سے سمجھوتے کے لیے تیار نہیں۔ اس اعلان کے بعد بھی مظاہروں کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ مسٹر بھٹو کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا تھا اور اب ان کی بیگم نصرت بھٹو بھی لیڈر ہوگئیں تھیں۔

۲۷ رجنوری کو مسٹر اصغر میر (انفارمیشن آفیسر مغربی پاکستان) کے ہمراہ میں منگلا ڈیم دیکھنے کے لیے گیا۔ منگلا ڈیم راولپنڈی سے ستر میل کے فاصلے پر میر پور میں واقع ہے اور ایشیا میں پانی کا سب سے بڑا ذخیرہ تصور کیا جاتا ہے۔ یہ ڈیم جہلم کے پانی کو آبپاشی کے لیے استعمال کرنے کی غرض سے تعمیر کیا گیا ہے اور اس کی لمبائی تقریباً چالیس میل ہے۔ منگلا ڈیم کی تعمیر حکومتِ پاکستان کا ایک تاریخی کارنامہ ہے اور اس کی وجہ سے پاکستان نے بہت حد تک پانی کی کمی پر قابو پالیا ہے۔ اگر چہ اس کی تعمیر سے تقریباً دوسو گاؤں اور ۸۰ ہزار لوگ متاثر ہوئے۔ ان لوگوں کو یہاں سے ہٹا کر مغربی پاکستان اور میر پور کے گردونواح میں زمینیں الاٹ کردی گئی ہیں۔ منگلا ڈیم سے کچھ میل کی دوری پر نیو میر پور نام کی ایک بستی آباد ہوگئی ہے۔ جہاں منگلا ڈیم سے اکھڑے ہوئے اشخاص کو آباد کیا گیا ہے۔ منگلا ڈیم کی تعمیر کا کام ۱۹۵۷ء میں شروع ہوکر ۲۳ رنومبر ۱۹۶۷ء کو مکمل ہوا اور اس پر کل دو ارب سے زیادہ روپیہ خرچ ہوا ہے۔ ڈیم کے کنارے ایک خوبصورت سڑک تعمیر ہوئی ہے اور دور سے یہ ایک

خوبصورت جھیل کا نظارہ پیش کرتا ہے۔ منگلا کی تعمیر اور تکمیل کا سہرا بھی صدر ایوب ہی کے سر ہے۔ لیکن آج پاکستان میں کوئی شخص اس بات کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ منگلا ڈیم کے ایک اعلیٰ آفیسر سے میں نے دریافت کیا کہ یہاں کوئی کشمیری بھی ملازم ہے تو انہوں نے کہا کہ ہاں ایک مسٹر عشائی ہیں، جو یہاں انجینئر ہیں۔ میں نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور کچھ دیر بعد مسٹر یاسین عشائی تشریف لائے۔ یاسین صاحب مرحوم غلام احمد عشائی کے فرزند ہیں۔ مختصر سے تعارف کے بعد ہی عشائی صاحب نے صدر ایوب اور شیخ صاحب کو بیک وقت گالیاں دینا شروع کر دیں اور پاکستانی افسر خاصے بدحواس نظر آنے لگے، کہ یہ کیا ہو گیا۔ یاسین صاحب صدر ایوب کی کنبہ پروری، بددیانتی اور اس کی آمریت کے خلاف اس شدت سے بول رہے تھے کہ جیسے وہ منگلا ڈیم میں ملازم نہ ہوں، بلکہ مجلس عمل کے لیڈر ہوں اور ساتھ ہی ساتھ شیخ صاحب کو بھی آڑے ہاتھوں لے رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ شیخ صاحب کو ان کے والد (مرحوم عشائی) نے لیڈر بنایا! اور پھر انہوں نے عشائی خاندان کو ہی برباد کر دیا۔ عشائی صاحب نے مولوی فاروق کی بڑی تعریف کی اور کہا کہ پاکستان کے لیے کشمیر بھر میں ایک ہی قابلِ اعتماد رہنما ہے اور وہ ہے مولوی فاروق۔ اُنہوں نے ساتھ ہی یہ انکشاف بھی کیا کہ فاروق صاحب کو بھی مرحوم عشائی نے ہی لیڈر بنایا ہے۔ یاسین صاحب کی اس غیر متوقع یلغار سے پاکستانی افسر، خاص طور پر مسٹر اصغر میر خاصے پریشان ہو گئے کہ ایک غیر ملکی اخبار نویس کے سامنے اس تقریر کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے موضوع ٹالنے کی خاطر سر درد کا بہانہ کیا اور اصغر میر نے فوراً ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔ اس طرح ایک نازک صورت حال ٹل گئی۔ کچھ دیر بعد مجھے

ڈیم سے ملحق ریسٹ ہاؤس میں پہنچایا گیا۔ جہاں ایران، ترکی اور سعودی عرب کے فوجی آفیسروں کو ڈیم کا پلان سمجھایا جا رہا تھا۔ میر صاحب نے ان فوجی افسروں سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا "یہ بھارتی مقبوضہ کشمیر کے ایک اخبار نویس اور ایم۔ ایل۔اے ہیں"۔ "کشمیر، خوبصورت کشمیر کا کیا حال ہے"؟ ایران کے فوجی افسر نے مجھ سے بڑی محبت سے پوچھا۔

"کشمیر کو ایرانِ صغیر کہتے ہیں، چھوٹے پیمانے پر وہی حال ہے جو ایران کا ہے"۔ میں نے کہا اور تینوں فوجی افسر ہنس دئے۔ اس کے بعد ہم جیپ میں سوار ہو کر منگلا ڈیم کی سیر کو چل دئے اور تقریباً ایک گھنٹے تک سیل دے، پاور ہاؤس اور ہاوسنگ کالونی دیکھتے رہے۔ ریسٹ ہاؤس میں ایک پر تکلف لنچ کا انتظام کیا گیا تھا۔ لنچ سے فارغ ہو کر ہم راولپنڈی کے لیے روانہ ہو گئے۔ لیکن روانہ ہونے سے پہلے میں نے وزیٹرس بک پر دستخط کر کے ڈیم کے متعلق اپنے تاثرات بھی قلم بند کئے۔ میں نے لکھا کہ "منگلا ڈیم" انسان کے عزائم و ارادوں کی ایک باوقار یادگار ہے اور پاکستان کے عوام اور یہاں کی حکومت اس عظیم کارنامے کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں"۔ منگلا سے راولپنڈی تک مسٹر اصغر میر ایک اچھے افسر اطلاعات کی طرح اپنا کام انجام دیتے رہے۔ وہ پاکستان کے ترقیاتی پلان کے علاوہ کشمیر کے متعلق پاکستانی موقف کی وضاحت بھی کرتے رہے اور ان کے پاس ہر بات کا جواب اور جواز موجود تھا۔ راولپنڈی پہنچ کر جب میں نے انہیں بتایا کہ میں بھی افسر اطلاعات رہ چکا ہوں، اور اخبار نویسی شروع کرنے سے پہلے میں محکمۂ اطلاعات میں ملازم تھا۔ تو انہیں یقین نہیں آیا۔ گھر پہنچ کر صابر صاحب نے اطلاع دی کہ وزیر خارجہ مسٹر ارشد حسین کے سیکرٹری نے صبح ۱۱ بجے ملنے کا وقت دیا تھا لیکن ہم لوگ

منگلا کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ اب انہوں نے شام کو بلایا ہے۔ میں فوراً تیار ہو کر اسلام آباد روانہ ہو گیا اور ٹھیک چھ بجے میں پاکستان کے وزیر خارجہ مسٹر ارشد حسین کی قیام گاہ پر موجود تھا۔ مسٹر حسین سے میرا انٹرویو اس اخبار میں اس سے قبل شائع ہو چکا ہے اور اس مرحلے پر میں صرف یہ کہنا چاہوں گا کہ میں ان کی ذہانت، معاملہ فہمی اور ان کے استدلال سے بے حد متاثر ہوا۔

۲۷ر جنوری کو دن کے تین بجے میں مظفر آباد کے لیے روانہ ہو گیا۔ راولپنڈی سے مظفر آباد کے لیے بسوں کے علاوہ سٹیشن ویگنیں بھی چلتی ہیں۔ مظفر آباد کے لوگ ان کو ڈبہ کہتے ہیں۔ یہ بسوں کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتار اور آرام دہ ہوتے ہیں۔ راولپنڈی سے مظفر آباد تک پانچ روپیہ کرایہ کی شرح مقرر ہے۔ میں ایک ایسے ہی ڈبے میں سوار کوہ مری سے ہوتا ہوا شام کو ۷ بجے کے قریب مظفر آباد پہنچ گیا۔ مظفر آباد میں چچا فاروق اپنے بہت سے دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ میرا استقبال کرنے کے لیے منتظر تھے۔ معلوم ہوا کہ فاروق صاحب مظفر آباد جیل کے عین مقابل رہتے ہیں۔ ساتھ ہی چچا بشیر کی رہائش گاہ ہے۔ میرے ٹھہرنے کا انتظام چچا بشیر کے ہاں ہوا تھا۔ اس لیے کہ فاروق صاحب کے پاس صرف ایک کمرہ تھا اور وہ بھی ایسا کہ اس میں ان کے علاوہ کوئی دوسرا رہ ہی نہیں سکتا۔ ہم سب لوگ بشیر صاحب کے ہاں جمع ہو گئے۔ بشیر صاحب نے مجھے دیکھتے ہی گلے لگا لیا اور ایک طرف لے جا کر سرگوشی کے انداز میں کہا ''بیٹا! ذرا محتاط رہنا، بات کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا کہ یہاں بہت سے لوگوں نے دوسروں کے متعلق بدگمانیاں پیدا کر کے اپنا الو سیدھا کر رکھا ہے''۔ میں نے چچا جان کو یقین دلایا کہ میں ایسے لوگوں کے وجود سے غافل نہیں کیونکہ اپنے ہاں بھی ایسے ''پیشہ وروں'' کی

تعداد کچھ کم نہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بشیر صاحب کے ہاں بہت سے دوست احباب جمع ہو گئے اور گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کچھ دیر بعد آزاد کشمیر کے ڈائریکٹر پبلسٹی محمد اقبال صاحب بھی تشریف لائے۔ موصوف نہایت ہی خوش خلق، ملنسار اور شگفتہ طبیعت کے مالک ہیں۔ ان کے چہرے پر ہر وقت ایک مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے اور وہ اس بے تکلفی سے قہقہہ لگاتے ہیں کہ ان سے پہلی ہی ملاقات مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ہماری ان سے برسوں کی جان پہچان ہو۔ اقبال صاحب نے کہا کہ ''ہم نے سرکاری گیسٹ ہاؤس میں بھی آپ کے قیام کا انتظام کیا ہے۔ آپ چاہیں تو وہاں منتقل ہو سکتے ہیں''۔ میں نے اس نوازش کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا، لیکن اس پیشکش سے استفادہ کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ میں بائیس برس بعد اپنے چچا سے مل رہا تھا اور چاہتا تھا کہ میں مظفر آباد میں اپنے قیام کا ایک ایک لمحہ ان کے ساتھ گذاروں۔

بشیر صاحب قبل از وقت ریٹائر ہو کر بڑی عسرت کی زندگی گذار رہے ہیں۔ وہ بیک وقت دل اور دمہ کے مریض ہیں۔ اُنہوں نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے (اور اب کرنے کا ارادہ بھی نہیں ہے) اور وہ زیادہ تر یادِ خدا میں مصروف رہتے ہیں۔ مجھے ان کے بارے میں صرف یہ معلوم ہے کہ وہ ملک کی تقسیم سے قبل نائب تحصیلدار تھے۔ اور نہایت کٹر قسم کے مسلم لیگی، جب قبائلیوں نے ریاست پر حملہ کیا تو بشیر صاحب اپنے سرکاری منصب کو بھول کر اس استقبالیہ کمیٹی کے رکن ہو گئے جو قبائلی ''مجاہدوں'' کا خیر مقدم کرنے کے لیے منظّم کی گئی تھی۔ بشیر صاحب بڑے ''سخت'' قسم کے نائب تحصیلدار تھے اور نیشنل کانفرنسی لیڈروں کے ساتھ ان کی اکثر ٹھنی رہتی تھی۔ وہ ۱۹۵۰ء میں پاکستان منتقل ہو گئے (بقول ان کے منتقل کر دیے گئے) اور مظفر آباد میں افسرِ مال

(ڈپٹی کمشنر ریونیو) کے عہدے پر تعینات رہے۔ مارشل لاء کے بعد بہت سے افسروں کی طرح قبل از وقت ریٹائر کر دیئے گئے۔ اب گوشہ عافیت میں بیٹھ کر ماضی کی یادوں کے سہارے زندگی گذار رہے ہیں۔ بشیر صاحب کا رہائشی مکان ایک ٹوٹا پھوٹا ''کوٹھا'' ہے۔ جو ہمارے ہاں گوجر لوگ جنگلوں میں تعمیر کر کے رہائش کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ نفاست پسند، بادشاہ مزاج اور حساس طبیعت بشیر احمد نے اس اندھیری کوٹھری میں زندگی کے بیس برس کیوں کر گذارے ہوں گے۔ ان کے چہرے کی جھریوں سے اس کشمکش کا اندازہ کیا جا سکتا تھا جو انہوں نے اس اجنبی دیار میں زندہ رہنے کے لیے کی ہوگی۔ رات بہت دیر تک چچا بشیر مجھے اپنی روداد سناتے رہے اور جب وہ تھک کر سو گئے تو فاروق صاحب نے مجھے آزاد کشمیر کی سیاست کے بھید بھاؤ سمجھانا شروع کر دئے۔ دوسرے دن علی الصبح میں اپنی دادی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے گیا۔ دادی کی قبر بشیر صاحب کے مکان سے وابستہ صحن کے ایک کونے میں دریائے جہلم کے کنارے واقع ہے۔ ان کا انتقال ۱۹۶۰ء میں مظفر آباد میں ہی ہوا تھا اور انہوں نے وصیت کی ہے کہ ان کی لاش کو امانتاً مظفر آباد میں دفن کر کے مناسب وقت پر کشمیر لے جایا جائے۔ پاکستان اور آزاد کشمیر میں مرنے والا تقریباً ہر شخص یہی وصیت کرتا ہے کہ اس کو یہاں امانتاً دفن کیا جائے اور آخر میں اس کی لاش کشمیر پہنچا دی جائے۔ وطن کی خاک میں نہ معلوم کون سی تاثیر ہے کہ مر کر بھی اس کی کشش انسان کو اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے۔

مظفر آباد ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور جن لوگوں نے اسے ۱۹۴۷ء سے قبل دیکھا ہے، ان کا کہنا ہے کہ پچھلے بیس بائیس برسوں میں یہاں بڑی زبردست

ترقی ہوئی ہے۔ قصبے کی وسعت، آبادی اور ذرائع میں کافی توسیع ہوئی ہے اور آزاد کشمیر حکومت کا صدر مقام ہونے کی وجہ سے تعمیر و ترقی کی رفتار بھی آزاد کشمیر کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں تیز رہی ہوگی، لیکن اس کے باوجود اس کی حیثیت شہر سے زیادہ ایک چھوٹے قصبے کی ہے۔ اصل شہر ایک بہت بڑی چٹان پر واقع ہے اور شہر کی اکثر آبادی اسی چٹان کے اوپر آباد ہے۔ پچھلے دس بیس برسوں میں اس چٹان کے دامن سے گذرتی ہوئی شاہراہ پر بھی مکانات اور دکانات کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ لیکن شہر کا بڑا بازار چٹان کے اوپری حصے پر ہی واقع ہے۔ شاہراہ عام سے اوپر جانے کے لیے جو راستہ بنا ہوا ہے وہ سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا چٹان کے آخری سرے پر ختم ہو جاتا ہے۔ اوپر جاتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں قاضی گنڈ سے بانہال کی طرف جا رہا ہوں اور چونکہ پیدل جانا پڑتا تھا، اس لیے منزلِ مقصود تک پہنچتے پہنچتے خاصی ورزش ہو جاتی تھی۔ اس پہاڑی یا چٹان جو کچھ بھی کہیے کی آغوش میں جگہ جگہ غریب لوگوں نے چھوٹی چھوٹی غاریں بنائی ہیں جو یہ لوگ اپنی رہائش کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی زندگی اور طرزِ رہائش کو دیکھ کر مجھے پرانے پتھر کا وہ زمانہ یاد آیا جس کا ذکر میں نے صرف تاریخ کی نصابی کتابوں میں پڑھا ہے۔ پاکستان کے مقابلے میں آزاد کشمیر کے لوگوں کا معیار زندگی ویسے بھی بہت پست ہے، لیکن پہاڑی کی آغوش میں کھدی ہوئی ان غاروں میں بسنے والے لوگوں کی حالت دیکھ کر میں لرز اٹھا، شاہراہِ عام سے لے کر مظفر آباد کی انتہا تک درجنوں ایسی غاریں، سینکڑوں انسانوں کے لیے زندگی کا واحد سرمایہ ہیں اور باوجود اس کے کہ آزاد کشمیر میں بڑی ترقی ہوئی ہے، غاروں میں بسنے والے ان بدنصیبوں کی حالت نہیں بدلی

ہے۔

مظفر آباد میرے لیے ایک شہر ممنوعہ ہی سہی لیکن یہاں کی مٹی بڑی مقدس، بڑی محترم اور بڑی مہمان نواز ہے۔ اس مٹی نے میرے بھائی ممتاز احمد کو اپنے سینے میں جگہ دے کر مجھ سے ایک خونی رشتہ قائم کرلیا ہے اور حق یہ ہے کہ مجھے پاکستان کا سفر کرنے کی ترغیب اور تحریک اسی خونی رشتے نے دی تھی۔ ممتاز صاحب میرے بڑے بھائی تھے۔ وہ انتہائی سادہ طبیعت اور درویش صفت آدمی تھے۔ ۱۹۵۱ء میں والد صاحب کی موت کے فوراً بعد اُنھوں نے ضد کی کہ وہ پاکستان جائیں گے اور ضد بھی ایسی کہ جب تک اسے پورا نہ کیا، چین سے نہیں بیٹھے۔ ۱۹۵۲ء کے آخر میں وہ پاکستان گئے اور پھر ۱۹۵۴ء میں فاروق صاحب کا خط آیا کہ وہ ایک پہاڑی پر سے گر کر داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اور اس طرح میری امیدوں کا آخری سہارا میرا اکلوتا بھائی، میری ماں کی آنکھوں کا تارا اور میری بہنوں کا راج دُلارا، مظفر آباد کی خاک میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سو گیا۔ آج میں پندرہ برس بعد اپنے رفیق بھائی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے آیا تھا۔ قبر پر تازہ تازہ مٹی پڑی ہوئی تھی۔ معلوم ہو رہا تھا کہ میری آمد کی خبر سن کر کسی عزیز نے اجڑی ہوئی قبر کو سنوارنے کی کوشش کی ہے اور کون جانتا ہے کہ جس قبر پر میں فاتحہ پڑھ رہا تھا وہ میرے بھائی کی قبر تھی۔ قبرستان میں بہت سی اور بھی قبریں تھیں اور اس اجنبی دیار میں اس قبر کو کون یاد رکھتا۔ میں فاتحہ پڑھتا جا رہا تھا اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا۔ مجھے آج پندرہ برس بعد اپنے بھائی کی یاد کچھ اس طرح آ رہی تھی کہ جیسے وہ آج ہی مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے ہوں اور میں یہ سوچنے لگا کہ کتنے ہی بھائی اپنی بہنوں اور بھائیوں سے

ملنے کی حسرت لیے ان اجنبی قبرستانوں میں دفن ہو چکے ہوں گے۔ قبرستان میں دور دور تک پھیلی ہوئی ان قبروں میں کتنے ہی ایسے ممتاز دفن ہوں گے کہ جن کے بھائی ان قبروں پر فاتحہ پڑھنے کی سعادت سے بھی محروم ہیں اور معلوم نہیں کہ آیندہ دس برسوں میں کتنی قبروں کے آثار تک مٹ جائیں گے اور جب کوئی شمیم اپنے ممتاز کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے آئے گا تو وہ دیوانوں کی طرح اس مٹی کی تلاش کرے گا کہ جس نے اس کے بھائی کے لیے اپنی آغوش وا کی تھی۔ بھائی ممتاز کی قبر میرے لیے بے کسی، بے چارگی، مجبوری اور مایوسی کی ایک مجسم علامت بن گئی اور میں یہ سوچنے لگا کہ ملک کی تقسیم نے کون سا مسئلہ حل کر دیا ہے؟ میں فاتحہ پڑھ کر چلنے لگا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میرے قدم اٹھنے سے انکار کر رہے ہوں۔ مجھے اپنے بھائی کی تنہائی، غریب الوطنی اور کسمپرسی کا احساس ستانے لگا، اپنے وطن سے سینکڑوں میل دور اس شہر میں جہاں اس نے اپنی زندگی سنوارنے کا خواب دیکھا تھا وہ آج اس طرح خاموش ہے کہ جیسے اُسے اس بات پر سخت ندامت ہو کہ وہ اپنا وطن چھوڑ کر یہاں کیوں آیا۔ میں نے دعا کے لے ہاتھ اٹھائے اور خدا سے دعا کی کہ ''اے میرے پروردگار! مجھے اپنے وطن کی مٹی نصیب کرنا کہ اجنبی دیس میں مر کر بھی انسانوں کو بے گانگی اور غیریت کا احساس ہوتا ہوگا۔ اسی لیے تو ہر کشمیری نے اپنے آپ کو یہاں امانتاً دفن کیے جانے کی وصیت کی ہے۔ اے خدائے ذوالجلال! وہ دن قریب آ جائے کہ جب سینکڑوں کشمیریوں کی وصیت پورا ہونے کی صورت پیدا ہو''۔

❁❁❁

12

آزاد کشمیر کی حکومت حقیقت کم اور افسانہ زیادہ ہے۔اس کا اندازہ مجھے پاکستان جانے سے پہلے ہی تھا۔لاہور اور راولپنڈی میں بہت سے کشمیری دوستوں نے میرے اس احساس کو تقویت پہنچائی کہ گذشتہ بیس اکیس برسوں میں پاکستانی حکام اس علاقے کو مفتوحہ تصور کر کے اس کے ساتھ ایک نوآبادی کا سا سلوک کر رہے ہیں۔مظفر آباد میں ایک نوجوان اخبار نویس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ''کہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے اخبار نویس بھارتی مقبوضہ کشمیر کے جواں سال صحافی کا خیر مقدم کرتے ہیں''۔اور اسکے بعد اکثر دوستوں نے بھارتی مقبوضہ کشمیر اور پاکستانی مقبوضہ کشمیر کی اصطلاحوں میں باتیں کیں۔مظفر آباد میں اپنے تین روزہ قیام کے دوران مجھے اچھی طرح یہ اندازہ ہو گیا کہ آزاد کشمیر کی حکومت محض ایک افسانہ ہے اور اس کا حقیقت کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں۔اسے بنیادی طور پر پاکستان کی وزارت امورِ کشمیر کا سیکرٹری چلاتا ہے اور اس کی مرضی کے بغیر پتا بھی نہیں ہلتا۔آزاد کشمیر کے صدر سردار محمد ابراہیم خان اپنی خودنوشت سوانح ''متاعِ زندگی'' میں اپنی برطرفی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بعینہ یہی بات خورشید صاحب کے ساتھ بھی ۱۹۶۴ء میں ہوئی۔خورشید صاحب نے بھی استعفیٰ دینے سے قبل جان توڑ کوشش کی کہ صدر پاکستان سے ملاقات نصیب ہو مگر ایسا نہ ہو سکا۔یہ بات اصول کی ہے کہ ایک ادنیٰ ملازم کو بھی ڈسمس کرتے وقت اُس کو آخری لفظ کہنے کا موقع ملتا ہے۔یا کم از کم یہ انسانیت کا آخری تقاضا ہے کہ الوداع ایک باعزت طریقے سے کی جائے...... انصاف کے بلند اصول بھی ایسے سلوک کا تقاضا کرتے ہیں کہ جس شخص کو آپ سزا دے رہے ہیں، اس کو اپنی بات سنانے کا آخری

موقع دیا جائے۔ افسوس کہ آزاد کشمیر کے صدر کو ڈسمس کرتے وقت یہ بھی مناسب خیال نہیں کیا گیا۔ یہ کشمیر اور آزاد کشمیر کی سیاست کا کس قدر دردناک پہلو ہے"۔

سردار ابراہیم آزاد کشمیر کے پہلے صدر ہیں اور انہی کی "قیادت" میں ۱۹۴۷ء میں آزاد کشمیر کی انقلابی حکومت قائم ہوئی تھی۔ وہ دوبار آزاد کشمیر کے صدر بنے اور دوبار ڈسمس کردئے گئے۔ ۱۹۵۹ء میں اپنی برطرفی کا قصہ یوں سناتے ہیں:

"۱۹۵۹ء کے وسط کے لگ بھگ مجھے وزارت امور کشمیر کے سیکریٹری صاحب کا کراچی سے ٹیلی فون پر پیغام ملا کہ صدر مجھ سے خوش نہیں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں استعفیٰ دوں............ جب مجھے سیکریٹری وزارتِ امور کشمیر کا پیغام بلائے ناگہانی کی طرح صادر ہوا، میں نے بڑی کوشش کی کہ صدر پاکستان سے ملاقات نصیب ہو سکے۔ مقصد اللہ شاہد ہے، اپنی صدارت کو بچانے کا نہیں تھا۔ اُس کی اُمید کم رہ گئی تھی۔ ذہنی طور پر اس کے لیے میں پہلے سے تیار تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ یہ معلوم ہو جائے کہ آخر گستاخی کون سی سرزد ہوئی ہے۔ مگر افسوس کہ ان کے افسروں نے انہیں اس ملاقات کے لیے مشورہ نہ دیا"۔

میر واعظ مولوی یوسف شاہ صاحب (مرحوم) سے بھی اسی طرح زبردستی استعفیٰ حاصل کیا گیا تھا اور ریڈیو پر اعلان کیا گیا تھا کہ انہوں نے ذاتی وجوہ کی بنا پر استعفیٰ دیا ہے۔

آزاد کشمیر کا آئین وزارتِ امور کشمیر کا تیار کردہ وہ ایکٹ ہوتا ہے جسے سیکرٹری نافذ کرتا ہے اور جس میں ترمیم کا آزاد کشمیر کی حکومت کو کوئی حق نہیں ہوتا۔ وزارتِ امور کشمیر وقتاً فوقتاً اس ایکٹ میں ترمیم کرتی رہتی ہے اور کبھی کبھی ایک بالکل ہی نیا ایکٹ لاگو کردیا جاتا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ ہر بار نیا ایکٹ پرانے ایکٹ سے زیادہ محدود، غیر جمہوری اور توہین آمیز ہوتا ہے۔ ایکٹ ۱۹۶۸ء کے نام سے پاکستانی

حکومت نے آزاد کشمیر پر جو آئین ٹھونسا ہے وہ اتنا غیر جمہوری اور مضحکہ خیز ہے کہ پورے آزاد کشمیر میں اس کے خلاف زبردست احتجاجی مظاہرے ہو رہے تھے۔ آزاد کشمیر کے تین سابق صدروں، سردار ابراہیم، کے۔ ایچ۔ خورشید اور سردار عبدالقیوم خان نے اس غیر جمہوری اور آمرانہ ایکٹ کے خلاف اتحادِ ثلاثہ قائم کیا ہے۔ اور جن دنوں میں مظفر آباد میں تھا، اس ایکٹ کے خلاف احتجاجی جلسے اور جلوس منظّم کئے جا رہے تھے۔ اس ایکٹ کی رُو سے آزاد کشمیر کے صدر کا درجہ ہمارے ہاں کے میونسپلٹی ایڈمنسٹریٹر سے بھی کم ہے اور پاکستان کے طول و عرض میں مقیم کشمیریوں نے اسے اپنے لیے ناقابل برداشت اور توہین آمیز قرار دیا ہے۔ مظفر آباد کے ایک نوجوان شاعر نے ایکٹ ۶۸ء کے عنوان سے ایک نظم کہی ہے، جو اس قابل ہے کہ اسے یہاں نقل کیا جائے:

آزاد کا آقا سی[ا] اے کو
بنوا دیا ایکٹ اٹھاسٹھ نے
اس صدر حکومت کو لیکن
دھوکا دیا ایکٹ اٹھاسٹھ نے
شعبوں کے ناظم بے دست و پا
مفلوج ہے عملۂ پائین بھی
اس ایکٹ میں صدر کا انگوٹھا
لگوا دیا ایکٹ اٹھاسٹھ نے
یاں صدر بھی صدر مجاز نہیں
یاں مجلس آئین ساز نہیں
جمہور کا منہ بے دردی سے

ا: چیف ایڈوائزر

کالا کیا ایکٹ اٹھاسٹھ نے
قانون و قواعد پنڈی سے
آزاد میں بن کر آئیں گے
ہم کالے ہیں وہ گورے ہیں
بتلا دیا ایک اٹھاسٹھ نے
سرچشمۂ طاقت پنڈی ہے
سلطانِ ریاست سی، اے ہے
اور اس کا گورنر ایس[۲] ایس کو
بنوا دیا ایکٹ اٹھاسٹھ نے
کفار سے جنگیں ہم نے لڑیں
خون ہم نے دیا کٹ ہم ہی گئے
اعوان[۳] کو تخت حکومت پر
بٹھا دیا ایکٹ اٹھاسٹھ نے
ایک فراڈ سٹیٹ کونسل ہے
اور بوگس اس کی ہیئت ہے
کچھ حرص و ہوا کے بندوں کو
ٹرخا دیا ایکٹ اٹھاسٹھ نے
جو منصب دارِ کلیدی ہیں
پنڈی سے مقرر ہوتے ہیں
اس دیش کے موتی دانوں کو

۲: سینئر سیکرٹری ۳: ہوم سیکرٹری پاکستان

بِکوا دیا ایکٹ اٹھاسٹھ نے

یہ صدرِ حکومت صدر نہیں

سی اے کا ادنیٰ ملازم ہے

اس شخص کے جذبہ غیرت کو

دفنا دیا ایکٹ اٹھاسٹھ نے

سپریم یہاں کی کورٹ نہیں

جمہور کورٹ کا حق بھی نہیں

انصاف کے ہر دروازے کو

تالا دیا ایکٹ اٹھاسٹھ نے

آزاد کشمیر کے موجودہ صدر عبدالحمید خان صاحب ہیں۔ جو تقسیم سے پہلے یہاں جج تھے اوراس کے بعد آزاد کشمیر میں چیف جسٹس رہ چکے ہیں۔ خانصاحب انتہائی نیک طنیت، شریف الطبع، پرہیز گار اور عابد آدمی ہیں۔ ان کی نیک دلی، حلیمی اور خدا ترسی کے قصے میں نے اپنے ہاں کے ان ججوں اور وکیلوں سے بھی سنے ہیں، جوانہیں جج کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ موصوف مشہور مسلم لیگی لیڈر اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے سابق وزیراعلیٰ خان عبدالقیوم کے بھائی ہیں۔ وانی گام پٹن میں ابھی تک ان کا مکان موجود ہے۔ زندگی بھر سیاست کے سائے سے بھی دور بھاگتے رہے اوران پر کبھی سیاسی آدمی ہونے کا شبہ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن آزاد کشمیر کے سیاسی انقلابات نے جہاں سردار ابراہیم خان، کے ایچ خورشید اور سردار عبدالقیوم جیسے جغادری لیڈروں کو منصبِ صدارت سے محروم کردیا۔ وہاں خان عبدالمجید خان جیسے غیر سیاسی، بے ضرر اور معصوم آدمی کے سر پر صدارت کا تاج بھی سجادیا۔ پاکستان اورآزاد کشمیر میں مقیم کشمیری لیڈر اس بات سے سخت بیزار ہیں کہ وزارتِ امور کشمیر نے ایک خالص غیر

سیاسی آدمی کو آزاد کشمیر کی صدارت سونپی ہے اور اس تمام غصے اور بیزاری کا مرکز بچارے عبدالحمید خان کی ذات ہے۔ حالانکہ خان صاحب کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ ۳۰؍جنوری کو جب میں ان کی سرکاری قیام گاہ پر ان سے ملا تو انہوں نے نہایت معصومیت کے ساتھ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا:

''خدا گواہ ہے کہ میں نے کبھی خود صدر بننے کی کوشش نہیں کی لیکن تائید خداوندی شامل تھی۔ اس لیے بغیر کسی کوشش کے صدر بنا دیا گیا۔ حالانکہ بہت سے لوگ اس منصب کے لیے سرتوڑ کوششیں کرتے رہے''۔

خان صاحب سے پہلی ملاقات میں، میں ان کی شرافت، سادگی اور پرہیزگاری کا قائل ہو گیا۔ اس ملاقات کے دوران آزاد کشمیر گورنمنٹ کے محکمۂ اطلاعات کے سیکریٹری غلام احمد پنڈت بھی موجود تھے اور صدر موصوف نے سیاسی موضوعات پر گفتگو کرنے سے احتراز کیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ صدر صاحب کو اپنی مجبوریوں اور معذوریوں کا شدید احساس ہے اور وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے ہیں۔ وہ بار بار سیاسی موضوعات پر بات کرنے سے کتراتے رہے۔ ایک گھنٹے کی ملاقات کے دوران انہوں نے مجھ سے صرف یہ بات کہی کہ ''کشمیر کا مسئلہ روز بروز پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے اور اب ہم لوگ اس کے حل کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے ہیں''۔

لیکن فوراً انہیں خیال آیا کہ اس بیان کو غلط سمجھا جا سکتا ہے اور انہوں نے اس کی وضاحت کرنا ضروری سمجھا۔ خان صاحب نے کہا ''یہ ٹھیک ہے کہ ہم تھک گئے ہیں، لیکن ہمیں امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے۔ کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا جو کچھ ہو گا، مسلمانوں کی بہتری کے لیے ہو گا۔ اگر مسئلے کے حل میں تاخیر ہو رہی ہے تو اس میں بھی ضرور کوئی مصلحت پوشیدہ ہو گی''۔

اس کے بعد وہ کشمیر میں اپنے پرانے دوستوں کے بارے میں پوچھتے رہے کہ وہ

کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ تقسیم سے قبل جب وہ سرینگر میں جج تھے انہوں نے لالہ تیرتھ رام سے کچھ روپے قرض لئے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ یہ روپیہ لالہ تیرتھ رام کے بھائی (جو تقسیم کے بعد بھی مظفر آباد میں رہتے تھے اور سارے آزاد کشمیر میں واحد غیر مسلم تھے) کو بالاقساط ادا کرتے رہے اور اب جب کہ ان کی وفات ہوگئی ہے۔ وہ یہ روپیہ اس کی بیوہ کو ادا کر رہے ہیں۔ خان صاحب نے کہا کہ کشمیر میں میرے بہت سے دوست ہیں۔ اور ان سے ملنے کو دل بہت چاہتا ہے۔ میں جان بوجھ کر انہیں خط نہیں لکھتا، کہ خواہ مخواہ غلط فہمی پیدا ہونے کا موقع نہ ملے۔ انہوں نے کہا کہ میں خواجہ غلام محمد صادق کو بھی جانتا ہوں، وہ ان دنوں وکالت کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے شیخ صاحب، بیگ صاحب، مسعودی صاحب اور بہت سے لوگوں کو سلام دیا۔ سب کا نام لیتے ہوئے صادق صاحب کا نام بھی ان کی زبان پر آ گیا، لیکن فوراً ہی اس کی تصیح کردی۔ ''نہیں صادق صاحب کو نہیں''۔ صدر آزاد کشمیر کی اس غیر معمولی احتیاط پر میں زیر لب مسکرایا کہ بچارا صدر ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو سرکاری ملازم تصور کرتا ہے۔ ہر ہر بات میں اس درجہ محتاط کہ صدر نہ ہوا قیدی ہوا۔ ایک گھنٹے کی ملاقات کے بعد جب میں ایوانِ صدر سے باہر آیا۔ تو میرے ذہن میں صرف یہ تاثر تھا صدر حمید خان کتنا شریف اور معصوم آدمی ہے۔ دراصل حکومت پاکستان نے خان صاحب کو لاکھوں میں سے ڈھونڈ کر نکالا ہے اور ان کی سب سے بڑی خصوصیت، ان کی شرافت اور معصومیت ہے۔ اور انہیں برائے نام صدر رہنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ کے۔ ایچ۔ خورشید اور سردار ابراہیم نے اپنی من مانیوں سے پاکستانی حکمرانوں کو بڑی مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا۔ صدر حمید خان کی ذات میں اب انہیں ایک ایسا صدر ملا تھا جو پاکستانی حکمرانوں کے نقطۂ نظر سے آئیڈیل ہے۔ صدر آزاد کشمیر کسی چپراسی کو تعینات یا ڈسمس نہیں کر سکتا۔ اس کا کام صرف ان فرمانوں پر دستخط کرنا ہے جو چیف ایڈوائزر کے دفتر سے موصول ہوں۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے کہ صدر نے اکونٹنٹ جنرل کے دفتر میں ایک کلرک کو اس لیے معطل کر دیا تھا کہ کلرک نے صدر کے سفرنامے کا بل پاس کرنے میں یہ اڑنگ لگائی تھی کہ صدر صاحب نے اپنے راولپنڈی جانے کا مقصد بیان نہیں کیا تھا۔ ایک دن اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ صدر نے کلرک کو معطل کر دیا ہے۔ دوسرے دن یہ خبر شائع ہوئی کہ کلرک کو چیف ایڈوائزر نے بحال کر دیا ہے۔ غرض آزاد کشمیر کے موجودہ صدر بے حد شریف آدمی ہیں!

اس رات عبدالرشید بٹ کے ہاں میری دعوت تھی جہاں آزاد کشمیر گورنمنٹ کے کئی اعلیٰ حکام بھی موجود تھے۔ کھانے پر زیادہ تر غیر سیاسی گفتگو ہوتی رہی اور اکثر لوگوں نے اپنے دوست احباب کے بارے میں دریافت کیا۔

۳۱ر جنوری کو میں میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ صاحب (مرحوم) کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے گیا۔ مرحوم مظفر آباد کالج کے قریب میونسپلٹی دفتر کے سامنے والے پارک میں امانتاً دفن ہیں اور انہی دنوں میر واعظ مرحوم کے برادران مولوی محمد شاہ اور یحییٰ شاہ صاحب مظفر آباد میں ان کی نعش کو سرینگر لے آنے کے لیے پاکستانی حکام سے بات چیت کر رہے تھے۔ میر واعظ مرحوم کی قبر پر فاتحہ پڑھتے ہوئے میں یہ سوچنے لگا کہ اس اجنبی دیار میں مرحوم کی قبر بھی کتنی اجنبی لگ رہی ہے۔ میر واعظ صاحب کی خواہش تھی کہ انہیں اپنے وطنِ عزیز میں دفن کر دیا جائے، لیکن میر واعظ صاحب کی زندگی میں ان کی کون سی خواہش پوری کی گئی تھی، جواب ان کی موت کے بعد پوری کی جاتی۔ مظفر آباد کے میونسپل پارک میں ان کی قبر پر ایک بے کسی اور کسمپرسی کا سا عالم طاری تھا۔ سرہانے پر صرف ایک غریب الوطن کشمیری دعائے مغفرت پڑھ رہا تھا۔ یہ قبر کشمیر میں ہوتی، تو اس پر صبح و شام میلہ لگا رہتا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے، کہ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام اپنے وطن کی یاد اور وطن لوٹنے کی حسرت میں گذارے!

پورے پاکستان میں ان دنوں تمام تعلیمی ادارے غیر معین عرصے کے لیے بند تھے، اس لیے مظفر آباد کا کالج بھی بند پڑا تھا۔ میں کالج کی عمارت دیکھنے کی غرض سے اندر گیا، تو گراونڈ میں پرنسپل صاحب اور دیگر اساتذہ ایک انگھیٹی کے گرد دھیمی دھیمی گفتگو میں مصروف تھے۔ ایک اجنبی کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر سارے لوگ میری طرف متوجہ ہو گئے۔ علوی صاحب نے میرا تعارف کرایا تو پرنسپل صاحب نے بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا اور اپنے ساتھیوں کو مجھ سے متعارف کر دیا۔ پرنسپل شیخ محمود صاحب ایس۔ پی۔ کالج میں لیکچرر رہ چکے ہیں اور اب کئی سال سے مظفر آباد میں پرنسپل ہیں۔ بعض اساتذہ نے کشمیر کے متعلق بڑے دلچسپ سوالات کئے اور میں نے بڑی صاف گوئی سے کام لے کر ان دوستوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ میری صاف گوئی سے وہ قائل ہوئے یا نہیں، لیکن اس سے متاثر ہوئے بغیر وہ نہ رہ سکے۔ رخصت ہونے سے قبل پرنسپل محمود نے پرخلوص لہجے میں کہا:

"یقین کیجیے کہ آج پورے سترہ برس بعد اس معیار کی گفتگو سننے میں آئی۔ تقسیم سے قبل جب تاثیر صاحب ایس پی کالج کے پرنسپل تھے، عموماً اساتذہ کے درمیان اس سطح کی گفتگو ہوا کرتی تھی"۔ شام کو زینب بیگم نے چائے پر مدعو کیا تھا۔ یہ وہی زینب بیگم ہیں جو یہاں معلّمہ تھیں اور جو ۱۹۶۵ء کے ہنگامے میں یہاں سے مظفر آباد پہنچ گئیں۔ محترمہ وہاں انٹرمیڈیٹ کالج کی پرنسپل ہیں۔

❁❁❁

”آمریت اور جمہوریت“: ایک موازنہ

میں ۱۶/ جنوری ۶۹ء کو پاکستان پہنچا، تو وہاں کے سیاسی حالات بے حد مخدوش تھے، میرے پاس صرف دس دن کا ویزا تھا او، مجھے اندیشہ تھا کہ پاکستانی حکام غیر معمولی سیاسی صورت حال کے باعث میرے ویزا کی میعاد میں توسیع نہ کریں گے جونہی میں نے ویزا میں توسیع کی درخواست پیش کی اس میں ایک ماہ کی توسیع کر دی گئی۔ اس کے بعد میں پورے چالیس دن بلا کسی پابندی یا دِقت کے پاکستان کے طول وعرض میں گھومتا رہا۔ سیاسی لیڈروں، عزیز واقارب، دوست واحباب اور ہموطنوں سے مل کر فرقت کے داغ مٹاتا رہا اور کسی نے مجھ سے کچھ نہ کہا۔ ویزا کی معیاد ختم ہوگئی تو مجھ سے پوچھا گیا کہ میں اس میں مزید توسیع تو نہیں کرانا چاہتا، میں نے شکریہ ادا کیا کہ نہیں اب بہت دن ہوگئے، گھر لوٹنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا تو میرے ویزا کی معیاد میں مزید ایک ماہ کی توسیع ہوسکتی تھی۔ یہ پاکستانی آمریت کی دریا دلی تھی۔

ایک ماہ قبل ترال کے غلام احمد صاحب جو عرصہ بائیس سال سے پاکستان میں مقیم ہیں، اپنے بھائی اور دوسرے رشتہ داروں سے ملنے کے لیے ایک مہینے کے لیے کشمیر آئے۔ ترالی صاحب پنڈی میں محکمہ اطلاعات کے ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں۔ کم گو، خاموش طبع اور سیدھے سادھے آدمی ہیں، وہ یہاں اپنے رشتہ

داروں کے علاوہ کسی سے بھی نہ ملے۔ مجھے اخبار نویس اور سیاسی آدمی سمجھ کر وہ مجھ سے بھی دور ہی رہے۔ وہ اپنے بیٹے کی شادی طے کر کے واپس جانا چاہتے تھے اور اس غرض کے لیے انہوں نے ویزا کی میعاد میں ایک ماہ کی توسیع کی درخواست دی۔ ویزا میں توسیع تو نہ ہوسکی لیکن مرکزی وزارت داخلہ نے ریاستی وزارت داخلہ کو ہدایت کی کہ ترالی صاحب کے ویزا میں ہرگز کوئی توسیع نہ کی جائے، اور انہیں ویزا کی معیاد ختم ہونے سے قبل ہی سرحد پار کرنے کو کہا جائے۔ ترالی صاحب نہ سیاسی لیڈر تھے، نہ صحافی اور نہ ممبر اسمبلی۔ وہ محض ایک سرکاری ملازم تھے۔ کشمیر میں سیاسی حالات بھی مخدوش نہ تھے لیکن اس کے باوجود ان کے ویزا میں ایک دن کی توسیع نہ ہوسکی۔ یہ ہندوستانی ''جمہوریت'' کی تنگ دلی ہے۔

13

مظفر آباد میں میری ملاقات ایک قادر بٹ نامی آدمی سے بھی ہوئی۔ یہ شخص سوپور کا رہنے والا ہے اور ۱۹۴۷ء کی جنگ میں اپنے وطن کو غیروں کے تسلط سے آزاد کرانے کے لیے آزاد کشمیر پہنچ گیا تھا۔ آج کل پلندری میں رہتا ہے اور وہیں سے مجھے ملنے کے لیے مظفر آباد آیا تھا۔ شکل وصورت بالکل اجڈ گنواروں کی سی، لیکن بات چیت سے اندازہ ہورہا تھا کہ خاصی سیاسی سوجھ بوجھ کا مالک ہے، قادر بٹ نے مجھے بتایا کہ وہ خواجہ ثناء اللہ بٹ (مدیر آفتاب) کا ساتھی تھا اور ۱۹۵۶ء میں اُسے بھی ثناء اللہ بٹ اور اس کے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ اس پار دھکیلنے کے لیے سرحد تک پہنچایا گیا تھا، لیکن آخری مرحلے پر اُس نے چالاکی سے کام لے کر اپنے آپ کو بچالیا۔ قادر بٹ کی باتوں سے معلوم ہورہا تھا کہ وہ اپنی چالاکی پر نادم ہے اور اسے اس بات کا افسوس ہے کہ وہ اس دن بچ کیوں گیا۔ کہنے لگا ''اب وطن کی یاد سینے میں ناسور بن کر رہ گئی ہے، اور آنکھوں میں امید کی روشنی بھی بجھ گئی ہے۔ آپ سے اتنی دور سے اس لیے ملنے آیا ہوں کہ آپ اس کشمیر سے آئے ہیں کہ جس کو آزاد کرانے کی ہوس میں ہم خود قید ہوگئے۔ آپ بھی قید ہیں لیکن آپ کی اور ہماری قید میں فرق یہ ہے کہ آپ اپنے گھر میں نظر بند ہیں اور ہم پرائے گھر میں''۔ مظفر آباد سے اردو یا انگریزی میں کوئی اخبار شائع نہیں ہوتا، لیکن صبح نو بجے تک راولپنڈی سے شائع ہونے والے سبھی اردو اخبارات یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ ان اخبارات کے مقامی نمائندوں نے ایک پریس کلب منظّم کیا ہے اور

۳۰ رجنوری کو اس کلب کی طرف سے میرے اعزاز میں ایک پرتکلف لنچ کا اہتمام کیا گیا، جس میں اخباری نمایندوں کے علاوہ آزاد کشمیر کے انفارمیشن سیکریٹری مسٹر غلام احمد پنڈت ڈائریکٹر انفارمیشن محمد اقبال اور بنیا دی جمہوریتوں کے ڈائریکٹر کرنل حسن بھی شامل تھے۔ غلام احمد پنڈت صاحب بے حد شریف، کم آمیز اور مخلص آدمی ہیں۔ وہ اخباری نمایندوں سے میری گفتگو کے دوران بالکل خاموشی سے میری باتیں سنتے رہے۔ آخر میں اُنہوں نے مجھ سے بڑے راز دارانہ لہجے میں پوچھا "یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن یہ بتائیے کہ آپ کے دل میں کیا ہے"؟ "میرا دل تو میری زبان پر ہے، میں نے ہنس کر جواب دیا لیکن وہ مطمئن نہیں ہوئے۔ انہیں یقین تھا کہ اصل بات چھپا رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ وہ اب بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں گے۔ سوالات اور جوابات کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے ہی یہ بات طے ہوگئی تھی کہ گفتگو کا کوئی حصہ اخبارات میں شائع نہ ہوگا۔ اس لیے اخبار نویسوں کو اور خود مجھ کو بھی آزادی سے بات کرنے کا موقع ملا۔ کرنل حسن صاحب جو آزاد کشمیر اور پاکستان میں "فاتح گلگت" کے نام سے مشہور ہیں نے سٹیٹ پیپلز کنونشن کے متعلق کچھ سوالات پوچھے۔ انہیں اس بات پر سخت اعتراض تھا کہ ہم نے کنونشن کے افتتاح کے لیے جے پرکاش نرائن جیسے ہندو اور ہندوستان نواز لیڈر کو کیوں مدعو کیا؟ انہوں نے بڑی صاف گوئی کے ساتھ مجھے بتایا کہ سٹیٹ پیپلز کنونشن کے متعلق پاکستان میں پہلے ہی لوگوں کا ردعمل اچھا نہ تھا، لیکن جب انہوں نے یہ سنا کہ اس کے افتتاح کے لیے ایک ایسے لیڈر کو دعوت دی گئی ہے جو کشمیر کو ہندوستان کا ایک حصہ بنائے رکھنے پر یقین رکھتا ہے تو ہم لوگوں کو کنونشن بلانے والوں کی نیت پر بھی شک ہوگیا۔ کرنل صاحب کا لہجہ کچھ

اس درجہ جارحانہ تھا کہ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے کہا کرنل صاحب! مجھے معاف کیجئے، سٹیٹ پیپلز کنونشن بلانے والوں کی نیت پر صرف پاکستان میں ہی شک نہیں کیا گیا، ہندوستان میں بھی بہت سے لوگوں نے اسے ایک پاکستانی سازش قرار دیا تھا۔ لیکن ہمیں اس کی پروا نہیں کہ پاکستان اور ہندوستان میں لوگ کیا کہتے ہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ریاست کے لوگ ایک جگہ بیٹھ کر اپنے مستقبل کے متعلق غور و فکر کریں۔ اور ظاہر ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جو لوگ کشمیر کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں۔ اُن کو کنونشن کے تصور سے خوشی نہیں ہو سکتی، کرنل صاحب فوجی آدمی ہیں اور انہیں سول ملازمت میں ہوتے ہوئے بھی اپنے فوجی ہونیکا شدید احساس ہے۔ کہنے لگے ''شمیم صاحب! آپ کچھ بھی کہیے، کشمیر کا مسئلہ طاقت کے بغیر حل نہیں ہو سکتا۔ اسے شیخ صاحب اور آپ جیسے سیاستدان کونشن بلا بلا کر حل نہیں کر سکتے، اسے صرف فوجی طاقت حل کر سکتی ہے''۔

''آپ فوجی طاقت استعمال کیجئے، آپ کو کون روکتا ہے اور وہ تو آپ ابھی تک کئی مرتبہ استعمال کر بھی چکے ہیں''۔ میں نے طعنہ دیا اور کرنل صاحب کو سخت غصہ آیا اور انہوں نے سیاستدانوں کو بے نقطہ سنانا شروع کر دی۔ ان کے خیال میں ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۶ء کی دونوں جنگوں میں پاکستانی سیاستدانوں نے پاکستانی فوج کے منصوبوں کو ناکام بنا دیا، ورنہ کشمیر کا مسئلہ حل ہو چکا ہوتا۔ اسکے بعد کرنل صاحب نے بڑی تفصیل کے ساتھ گلگت کو فتح کرنے کا قصہ سنایا کہ ۱۹۴۷ء میں کس طرح انہوں نے ڈوگرہ فوج کو محاصرے میں لے کر برگیڈیر گھنسارا سنگھ کو حراست میں لے لیا اور بغیر ایک گولی چلائے سارے گلگت پر قبضہ کر لیا۔ کرنل حسن کے بارے میں معلوم ہوا کہ راولپنڈی سازش

کیس میں بھی ملوث تھے اور صدر ایوب کے دور میں آزاد کشمیر میں بنیادی جمہوریتوں کے ڈائریکٹر بنائے گئے۔

لنچ سے فارغ ہوکر میں آزاد کشمیر حکومت کا سیکرٹریٹ دیکھنے گیا۔ یہ سیکریٹریٹ اسی جگہ تعمیرا ہوا ہے جہاں تقسیم سے پہلے مظفرآباد کی تحصیل تھی بلکہ اسی تحصیل کوتوسیع دے کراسے سکریٹریٹ میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔اس کے اردگرد ایک منزلہ عمارتیں تعمیر ہوئی ہیں، جن میں آزاد کشمیر کے سبھی سرکاری دفاتر قائم ہیں۔

ساتھ ہی ہائی کورٹ کی عمارت بھی واقع ہے، جو اپنی بے چارگی اور بے بساطی پر ماتم کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ آزاد کشمیر کی Last court of appeal ہے اور اسے Writ جاری کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ بالفاظ دیگر اس عدالت کے فیصلے کے خلاف پاکستان کی سپریم کورٹ میں اپیل دائر نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی اس عدالت سے حکومت کے خلاف کوئی رِٹ جاری ہوسکتا ہے۔عدل وانصاف کے اس فرسودہ نظام کے خلاف آزاد کشمیر کے ایڈوکیٹ اور وکیل صاحبان ایک عرصے سے جدوجہد کر رہے ہیں لیکن ابھی تک انہیں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ان تمام مجبوریوں کے باوجود عام لوگوں کا لیہ کی غیر جانبداری اور خود مختاری پر اعتماد قائم ہے اور میں نے آزاد کشمیر ںومت کے شدید مخالفوں کو بھی ہائی کورٹ کے ججوں کی آزادی اور غیر ںانبداری کی تعریف کرتے ہوئے سنا۔

چار بجے کے قریب میں اپنی رہائش گاہ پر پہنچا۔ تو چچا بشیر نے کہا کہ بہت سے لوگ ملنے کے لیے آئے تھے اور کافی دیر انتظار کرتے رہے۔ انہوں نے خاص طور پر شیخ عبدالحی کا ذکر کیا کہ وہ دو گھنٹے تک میرا انتظار کرتے رہے۔ان

کا ذکر ہو ہی رہا تھا کہ وہ دوبارہ تشریف لائے۔ شیخ عبدالحی جموں میں تحریکِ حریت کے اولین رہنما مستری محمد یعقوب کے فرزند ہیں۔ آزاد کشمیر میں فائنانس سیکریٹری رہ چکے ہیں۔ قبل از وقت ریٹائیر ہو کر اب وکالت کرتے ہیں۔ شیخ صاحب میرے اخبار ''آئینہ'' کے ذریعے مجھ سے متعارف تھے۔ اس لیے پہلی ہی ملاقات میں یوں بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے کہ جیسے ہماری برسوں پرانی ملاقات ہو۔ انہوں نے ۱۹۴۸ء میں اپنے جموں چھوڑنے کی کہانی بیان کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا کہ ''گردھاری لعل ڈوگرہ (وزیر مال جموں و کشمیر) نے اس وقت سخت اصرار کیا تھا کہ میں جموں چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں لیکن میں مسلمانوں کے مستقبل سے اس درجہ مایوس ہو چکا تھا کہ میں نے ایک نہ مانی۔'' شیخ صاحب نے خواجہ غلام محی الدین قرہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ قرہ صاحب نے ۱۹۴۸ء میں سب سے پہلے بعض ہندوستانی فوجی سپاہیوں کی زیادتیوں کے خلاف احتجاج کیا تھا اور اس سے میرے دل میں ان کے لیے بے حد عزت اور احترام پیدا ہو گیا تھا جو آج بھی قائم ہے۔ سٹیٹ پیپلز کنونشن کا ذکر کرتے ہوئے شیخ صاحب نے یہ شکایت کی کہ پاکستان اور آزاد کشمیر میں ایسے لوگوں کے نام بھی کنونشن میں شرکت کے دعوت نامے وصول ہوئے کہ جن کا نہ کوئی سیاسی کردار ہے اور نہ وجود۔ بلکہ کچھ فوت شدہ اشخاص کے نام بھی دعوت نامے جاری کیے گئے تھے اور اس کے مقابلے میں ان لوگوں کو نظر انداز کیا گیا تھا کہ جن کی ساری زندگی تحریک حریت کشمیر میں صرف ہوئی ہے۔ میں نے معذرت کی کہ دعوت نامے بڑی جلدی میں جاری کیے گئے تھے اور جو نام جس کے ذہن میں آ گیا اس کے نام دعوت نامہ بھیجا گیا اور ایسا کرتے ہوئے کچھ اہم نام چھوٹ گئے ہوں گے۔

میں نے شیخصاحب کو یقین دلایا کہ کنونشن کے دوسرے اجلاس میں اس کوتاہی کو دور کر دیا جائے گا۔

اس کے بعد کشمیر کے سیاسی مستقبل کے متعلق ان کے ساتھ سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ شیخ صاحب نے جس صفائی، دیانت داری اور وضاحت کے ساتھ کشمیر کی موجودہ اُلجھن کا تجزیہ کیا، اس سے مجھے ان کے گہرے سیاسی شعور اور ان کی حقیقت پسندی پر ایمان لانا ہی پڑا۔ انہوں نے کشمیر کے مسئلے کو بین الاقوامی پس منظر میں پیش کر کے ان مشکلوں اور اڑچنوں کا ذکر کیا، جو اس کے حل ہونے میں حائل ہیں اور جن کے ہوتے ہوئے اس کے حل ہونے کے امکانات تاریک ہیں۔

شام کو چچا فاروق نے میرے اعزاز میں ایک پرتکلف عصرانہ دیا، جس میں بار ایسوسی ایشن کے ممبران اور جج صاحبان کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ مہمانوں میں ملک محمد اسلم سیشن جج، چوہدری احسان الحق سب مجسٹریٹ، چوہدری فضل حسین، ایس پی سردار محمد یاسین، ایڈووکیٹ (پونچھ) خواجہ محمد سعید (پلیڈر) خواجہ عبدالصمد اے ڈی ایم، شیخ عبدالحمید ایڈووکیٹ، سید غلام حسین شاہ پبلک پراسکیوٹر کے علاوہ آذر عسکری نامی شاعر بھی موجود تھے۔ آذر عسکری صاحب پیشے کے اعتبار سے گھڑی ساز ہیں اور سرینگر میں ''بکس اینڈ کو'' واچ ہاسپٹل میں کام کر چکے ہیں۔ مظفر آباد میں ان کی اپنی دکان ہے۔ اردو کے بہت اچھے شاعر ہیں۔ ان کا زیادہ تر کلام مزاحیہ ہوتا ہے۔ چائے کے بعد بہت دیر تک ان سے مزاحیہ کلام سنتے رہے۔

رات کو میر ہدایت اللہ صاحب نے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ چچا مشتاق کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ اور رات گئے تک وطن اور اہلِ وطن کی باتیں

ہوتی رہیں۔ باہر موسلا دھار بارش شروع ہوگئی تھی اور ہم اندر خوابوں کی بستیاں آباد کر رہے تھے۔ میر صاحب بہت پرانے سیاسی کارکن ہیں۔ میر واعظ مرحوم کے رفیقانِ خاص میں تھے اور ان کے دور صدارت میں مشیر رہ چکے ہیں۔ نہایت ہی سنجیدہ، متین اور متوازن شخصیت کے مالک ہیں اور سیاسیات کشمیر پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ آزاد اور خود مختار کشمیر کے زبردست حامی ہیں۔ لیکن کھل کر اس کی وکالت کرنے کے سلسلے میں قدرے محتاط ہیں، کہنے لگے کہ ''آپ وہاں کے لوگوں کو سمجھایئے کہ ان کا مستقبل صرف آزادی اور خود مختاری میں ہی محفوظ ہے۔ ہندوستان کے بارے میں وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ پاکستان بھی خوابوں کی وہ جنت نہیں جو وہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ آخر وہ لوگ ہمارے تجربات سے فائدہ کیوں نہیں اٹھا سکتے''۔ میں نے کہا ''میر صاحب آپ کے ہمارے درمیان جہالت اور لاعلمی کی اتنی بڑی دیواریں ہیں، کہ ان کے ہوتے ہوئے ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنا مشکل ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دیواروں کو ڈھائے کون''۔ ''آپ جیسے نوجوان اور کون؟ آپ نوجوان ہیں، اہل قلم ہیں اور خدا کے فضل سے اہل نظر بھی، آپ جیسے لوگوں کو جہالت، گمراہی اور غلط فہمیوں کی اس دیوار کو ڈھا دینا چاہیے''۔ میر صاحب کا مدہم لہجہ اونچا ہوتا گیا اور مجھے محسوس ہوا کہ ان کا سینہ درد کی شدت سے پھٹا جا رہا ہے۔ ان کی آواز میں مجھے ایک ایسی تھرتھراہٹ کا احساس ہوا کہ جو خوابوں کا محل ٹوٹنے کے بعد ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ محفل میں شامل بہت سے دوستوں نے میر صاحب کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ کشمیر کو ہندوستان اور پاکستان دونوں کے ساتھ خوشگوار دوستانہ تعلقات قائم کر کے ایک آزاد اور خود مختار ریاست کا درجہ حاصل ہونا

چاہیے۔ آخر میں محاذِ رائے شماری کے جنرل سیکریٹری غلام مصطفیٰ علوی صاحب نے میر واعظ مولوی یوسف شاہ مرحوم کا ایک لطیفہ سنا کر پوری محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ لطیفہ جہاں میر واعظ مرحوم کی ظرافت اور ان کی خوش مذاقی کا آئینہ دار ہے، وہاں اہل کشمیر کی نفسیات پر ایک گہرا طنز بھی ہے اس لیے علوی صاحب ہی کی زبان میں آپ بھی اس سے لطف اندوز ہو جائیے۔

''۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران جب میں سرحد پار کر کے کسی طرح پاکستان پہنچ گیا تو چند دن بعد میر واعظ حضرت مولانا مولوی محمد یوسف شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میر واعظ صاحب ان دنوں اصغر مال کی کوٹھی میں مقیم تھے۔ میں نے اطلاع کرا دی اور کچھ دیر بعد میر واعظ صاحب باہر کے کمرے میں تشریف لائے۔ مجھ سے دریافت کیا میں کون ہوں اور کیسے آیا ہوں۔ میں نے کہا قبلہ مجھے علوی کہتے ہیں اور آپ کا بہت پرانا عقیدت مند ہوں۔ ابھی کچھ دن ہوئے کشمیر سے آیا ہوں۔ کیسے آنا ہوا؟ میر واعظ مرحوم نے کچھ اس انداز سے پوچھا کہ جیسے میرے آنے سے کچھ ناراض ہوں''۔ قبلہ، صدائے کشمیر سے آپ کی تقریر سن کر اس درجہ متاثر ہو گیا کہ سوچا جب تک اس جہاد میں شریک نہ ہو جاؤں، مجھے نجات نہ ملے گی۔ بس اُسی وقت عازم سفر ہو گیا اور آپ کے قدموں میں ہوں'' میں نے میر واعظ صاحب کو خوش کرنے کے لیے کہا۔

''مجھے چرسیوں کا ایک لطیفہ یاد آرہا ہے''۔ میر واعظ مرحوم نے کمال سنجیدگی سے لطیفہ سنانا شروع کر دیا۔ ''ایک بار تین چرسی کشتی پر سوار ڈل کی سیر کو جا رہے تھے۔ ایک چرسی کھانا پکا رہا تھا اور باقی دو چرسی کش لگانے میں مصروف تھے۔ کچھ دیر بعد ایک چرسی (جو کھانا پکا رہا تھا) چاولوں کی ایک دیگ

لے کر کشتی کے ایک سرے پر لے جا کر اس میں سے پیچ نکال رہا تھا کہ دیگ اس کے ہاتھ سے پھسل کر ڈل میں جا گری۔ پرتر سے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے ڈل میں کود گیا۔ باقی دو چرسی یہ نظارہ دیکھ رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ بے ایمان نے چالاکی سے کام لیا ہے۔ دیگ کو جان بوجھ کر ڈل میں پھینک دیا ہے اور اب وہیں بیٹھا کھا رہا ہوگا۔ میں اسے اکیلے نہ کھانے دوں گا اور یہ کہہ کر وہ بھی جھٹ ڈل میں کود گیا۔ تیسرا سوچنے لگا ہو نہ ہو دونوں نے پہلے سے ہی یہ پروگرام بنایا ہو اور اب دونوں پانی کے نیچے مزے سے کھانا کھا رہے ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے بھی ایک جست لگائی اور وہ بھی ڈل کی گہرائیوں میں ڈوب مرا۔ تم لوگوں پر بھی یہی مثال صادق آتی ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ ہم لوگ جو یہاں آگئے ہیں، ہم نے سب کچھ کھالیا اور تم پیچھے رہ گئے۔ اس لیے تم چرسیوں کی طرح سوچے سمجھے بغیر ڈبکی لگا دیتے ہو اور تمہارا انجام بھی وہی ہوگا، جو ان چرسیوں کا ہوا تھا۔ اس وقت مجھے میر واعظ مرحوم کا کہنا بہت برا لگا تھا، لیکن آج مجھے ان کے تجربے، دور اندیشی اور معاملہ فہمی کا احساس ہو رہا ہے''۔ کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو بارش بدستور جاری تھی، بلکہ اس کی شدت میں کچھ اضافہ ہی ہو گیا تھا۔ موسم میں زمہریر کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اور ایسا لگ رہا تھا بڑے زوروں کی برف گرے گی۔

یہ مظفر آباد میں میری آخری رات تھی اور کون کہہ سکتا تھا کہ میں اس شہر ممنوعہ میں دوبارہ قدم رکھ سکوں گا یا نہیں۔ اس احساس نے اس رات کے ایک ایک لمحے کو میرے لیے اور میرے میزبانوں کے لیے اتنا قیمتی بنا دیا تھا کہ ہم میں سے رات ڈھلنے تک کوئی بھی نہ سو سکا۔ چچا بشیر بیمار ہیں۔ میں نے انہیں آدھی رات کے قریب سونے پر مجبور کر ہی دیا۔ لیکن چچا مشتاق صبح کاذب تک

اپنی بے پناہ قوت تقریر کا مظاہرہ کرتے رہے۔

صبح ہوئی تو پورے مظفر آباد پر برف کی ایک ہلکی سی چادر بکھر گئی تھی۔ معلوم ہوا کہ مری کا راستہ بھی بند ہے اور ایبٹ آباد کا بھی۔ اس لیے دونوں طرف سے نہ کوئی بس آسکے گی اور نہ جا سکے گی۔ یہ سن کر مجھے بے حد مایوسی ہوئی، کیونکہ میں مظفر آباد کی تنگ دامنی سے گھبرا کر راولپنڈی لوٹنے کے لیے بے قرار تھا۔ معلوم ہوا کہ کبھی کبھی برفباری کی وجہ سے مظفر آباد اور راولپنڈی کا ''الحاق'' بھی کچھ دنوں کے لیے ٹوٹ جاتا ہے۔ بقولِ چچا مشتاق ''کچھ دنوں کے لیے کشمیر کا یہ حصہ آزاد اور خود مختار بن جاتا ہے''۔ بہر حال ایبٹ آباد کے راستے ایک سٹیشن ویگن راولپنڈی جانے کے لیے تیار ہوگئی اور میں اس پر سوار ایبٹ آباد کے لیے روانہ ہوگیا۔ چچا مشتاق نے بہت ڈرایا کہ راستہ بہت خطرناک ہے۔ سفر خطرے سے خالی نہیں لیکن میں نے ایک نہ مانی۔ چچا جان کا کہنا ٹھیک تھا۔ یہ سفر میری زندگی کا انتہائی دشوار گذار سفر تھا۔ جوں ہی ہم مظفر آباد سے کچھ دور نکل گئے، شدید بارش شروع ہوگئی اور لاہور گلی کے قریب تو بالکل اندھیرا چھا گیا۔ گاڑی اس طرح پھسل رہی تھی کہ مجھے اپنی موت بالکل سامنے نظر آنے لگی۔ میں سوچنے لگا کہ دیکھو میری موت کہاں مقدر تھی۔ گاڑی کا ڈرائیور بہت ہی تجربہ کار تھا، لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے سے تردّد اور پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ خدا خدا کرکے لاہور گلی کا پر پیچ راستہ طے ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی موسم بھی قدرے بہتر ہوگیا۔ کچھ دیر بعد ڈرائیور نے میرا حسب ونسب، میری تاریخ اور میرا جغرافیہ دریافت کرنا شروع کردیا اور جب میں نے اس سے کہا کہ میں کشمیر سے آیا ہوں تو وہ بہت خوش ہوا، کہنے لگا کہ افسوس ہے کہ ہم ابھی تک آپ کو آزاد نہیں کرا سکے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں

ہم نے معاملہ بالکل طے کر دیا تھا مگر سالے ہندوستانیوں نے لاہور پر حملہ کر کے بے ایمانی کی ورنہ ہم ایک دو دن کے اندر کشمیر پہنچ گئے ہوتے۔ یہ ڈرائیور ہی کا نہیں بلکہ بہت سے پاکستانیوں کا خیال ہے اور اکثر پاکستانیوں کو ہندوستان سے یہ شکایت ہے کہ ہندوستان نے لاہور پر حملہ کر کے پاکستان کے منصوبوں کو ناکام کیوں بنایا۔

14

ایبٹ آباد پاکستان بننے سے پہلے ایک فوجی چھاونی تھی اور یہاں زیادہ تر انگریز فوجی افسر رہا کرتے تھے۔ آب و ہوا کے لحاظ سے یہ کشمیر سے اس درجہ مشابہ ہے کہ جن لوگوں کو کشمیر کی جنت نصیب نہ تھی، وہ یہاں کچھ دن گذار کر کشمیر کی ہوس پوری کر لیتے، انگریز فوجی افسروں نے اس کی قدرتی خوبصورتی، محل، وقوع اور آب و ہوا کے پیش نظر اسے صحت افزا مقام کا درجہ دیا تھا۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد یہاں بہت سے مہاجر آ کر آباد ہو گئے ہیں اور اب یہ ایک چھوٹا موٹا شہر بن گیا ہے۔ میرے چچا عبدالرحیم نے یہاں کالج روڈ پر پاکستان کے سابق وزیر خزانہ شعیب قریشی کی کوٹھی خریدی ہے۔ صابر صاحب نے بھی ''گوشۂ صبر'' کے نام سے یہاں مکان تعمیر کیا ہے اور میرے چچازاد بھائی غلام محی الدین نے بھی یہیں اپنا مکان بنالیا ہے۔ صابر صاحب اور رحیم صاحب سردیوں میں راولپنڈی اور لاہور جاتے ہیں اور گرمیوں میں واپس ایبٹ آباد آجاتے ہیں۔ غلام محی الدین یہاں ہسپتال میں ملازم ہے اور میں اُسی سے ملنے کے لیے ایبٹ آباد آیا تھا۔ یہ یکم فروری کا دن تھا اور اس دن چونکہ یہاں بھی برفباری ہوئی تھی، اس لیے بڑی سخت سردی پڑ رہی تھی شام کو صدر ایوب کی ماہانہ تقریر نشر ہونے والی تھی سب لوگ بے صبری سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ عام خیال یہ تھا کہ صدر کوئی غیر معمولی اور غیر متوقع اعلان کرنے والے ہیں۔ شام کو صدر نے اپنی تقریر میں تمام مخالف لیڈروں کو بات چیت کی دعوت دی اور اس بات پر رضامندی ظاہر کی، کہ وہ حزب مخالف کے

لیڈروں سے بات چیت کر کے آئین میں مناسب ترامیم کرنے کے لیے تیار ہیں۔ صدر کا یہ اعلان ان کے مخالفوں کی ایک بہت بڑی فتح تھی، کیونکہ صرف پندرہ دن پہلے صدر نے کہا تھا کہ میں مخالف لیڈروں میں سے کس سے بات کروں، ان کی بساط ہی کیا ہے۔ پندرہ دن کے اندر اندر پاکستانی عوام نے صدر کا غرور بھی توڑ دیا تھا اور اس کی حکومت کی بنیادیں بھی ہلا دی تھیں۔ صدر ایوب کی حقیقت پسندی اور عاقبت اندیشی کی داد نہ دینا انکے ساتھ زیادتی ہوگی، انہیں اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ سنگینوں اور گولیوں سے عوامی بغاوت کے سیلاب کو روکنا ممکن نہ ہوگا اور اسی لیے انہوں نے رفتہ رفتہ اپنے مخالفوں کے سامنے جھکنا شروع کر دیا۔ یکم فروری سے مارچ کے پہلے ہفتے تک وہ اپنے مخالفوں کا ایک ایک مطالبہ مانتے گئے، لیکن پاکستانی عوام کی بدقسمتی اور مخالف لیڈروں کی خودغرضی نے اس انقلاب کو اپنے منطقی انجام تک نہیں پہنچنے دیا۔ اور نتیجہ یہ کہ عین اس وقت جب کہ پاکستانی عوام کی جدوجہد کامیاب ہو کر آزادی، جمہوریت اور انصاف کی منزل سے ہمکنار ہونے والی تھی، پاکستان میں ایک بار پھر فوجی راج قائم کر دیا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ناکامی کا اصل سبب پاکستان کے سیاسی لیڈروں کی خودغرضی اور تنگ دلی ہے اور کچھ نہیں۔

صدر ایوب نے اپنی تقریر میں یہ نہیں کہا تھا کہ وہ کس کس مخالف لیڈر کو بات چیت میں شرکت کی دعوت دیں گے۔ اس لیے مخالف لیڈروں نے اپنا فوری ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ دوسرے دن صدر نے جمہوری مجلس عمل کے سربراہ نواب زادہ نصر اللہ خان کے نام ایک خط میں انہیں دعوت دی کہ وہ ان کی جانب سے ان تمام مخالف لیڈروں کو بات چیت میں شرکت کی دعوت دیں

جن کی شمولیت کو وہ بات چیت کی کامیابی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔
دوسرے الفاظ میں صدر نے نواب زادہ نصر اللہ کو ایک بلینک چیک دیدیا۔
صدر کی اس حکمت عملی سے مخالف لیڈروں میں ایک ہل چل مچ گئی۔ وہ اس غیر متوقع کامیابی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھے۔ صدر نے گیند ان کے صحن میں پھینک دی تھی اور اب مخالف لیڈروں کا باہمی تضاد ظاہر ہونے لگا۔
ذوالفقار علی بھٹو اور ائیر مارشل اصغر خان کو بات چیت کی دعوت براہِ راست نہیں دی گئی تھی، بھٹو نے اعلان کیا کہ جس بات چیت میں مجھے دعوت نہیں دی گئی ہے، اس کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ ائیر مارشل اصغر خان نے صورت حال میں ایک نیا عنصر داخل کر دیا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ مولانا بھاشانی اور مجیب الرحمٰن کو بات چیت میں شریک کیا جائے۔ مجیب الرحمٰن کے خلاف اگرتلہ سازش کیس چل رہا تھا اور وہ نظر بند تھے۔ صدر نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی کہ ایک ایسے شخص کو جس کے خلاف ملک سے غداری کے الزام میں مقدمہ چل رہا ہے بات چیت میں کیسے شریک کیا جا سکتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ صدر نے ہتھیار ڈالنا شروع کر دئے۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ مجیب الرحمٰن کو نظر بندی کی حالت میں راولپنڈی لایا جائے اور انہیں بات چیت میں شریک کر دیا جائے۔ مجیب الرحمٰن نے اعلان کیا کہ میں قیدی کی حیثیت سے بات چیت میں شریک ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اب یہ مطالبہ زور پکڑنے لگا کہ اگرتلہ سازش کیس واپس لیا جائے۔ اس بات کے لیے صدر بالکل تیار نہ تھے، لیکن بالآخر انہیں یہ مطالبہ بھی تسلیم کرنا ہی پڑا اور مجیب الرحمٰن اور ان کے تمام ساتھیوں کے خلاف سازش کا مقدمہ واپس لے لیا گیا۔

دوسرے دن راولپنڈی سے شائع ہونے والے اخبارات میں میرے

مظفرآباد کے دورے کی خبر چھپی تھی۔ روزنامہ ''کوہستان'' راولپنڈی نے مظفرآباد میں اپنے نمائندہ خصوصی کے حوالے سے یہ مراسلہ شائع کیا۔

''بھارتی مقبوضہ کشمیر اسمبلی کے ایک رکن اور ہفت روزہ ''آئینہ'' سرینگر کے مدیر مسٹر شمیم احمد شمیم مظفرآباد میں چار روزہ قیام کے بعد ایبٹ آباد کے راستہ راولپنڈی روانہ ہوگئے۔ مسٹر شمیم نے اپنے چار روزہ قیام میں عزیز و اقارب سے نجی ملاقاتوں کے علاوہ مقامی وکلاء شیخ عبدالحمید، شیخ عبدالحی سے بھی ملاقاتیں کیں۔ جمعرات کے روز پریس کلب کی طرف سے مسٹر شمیم کے اعزاز میں ظہرانہ دیا گیا۔ جس میں سرحد کے دونوں جانب کشمیری عوام کو درپیش مسائل کے بارے میں تبادلۂ خیال ہوا۔ مسٹر شمیم نے خیال ظاہر کیا کہ جنگ بندی لائن کے دونوں جانب بسنے والے ریاستی عوام کو جن کی اکثریت حقیقی رشتہ داروں سے گزشتہ اکیس سالوں سے جدا ہوچکی ہے ایک دوسرے کے ساتھ ملنے کی اجازت ہونا چاہیے۔ انہوں نے یہ بھی تجویز کی کہ دونوں جانب سے بسنے والے اخبارنویسوں اور صحافیوں کو خاص طور پر حالات کا مطالعہ کرنے کی خاطر آنے جانے کی سہولتیں حکومتِ بھارت اور پاکستان کو مہیا کرنی چاہئیں۔ اخبارنویسوں کے آنے جانے سے کئی قسم کی غلط فہمیاں بھی دور ہوجایا کریں گی۔ جمعہ کے روز مسٹر مشتاق احمد فاروق وکیل نے مسٹر شمیم کے اعزاز میں عصرانہ دیا۔ مسٹرم شمیم نے مظفرآباد میں میر واعظ کشمیر مولانا محمد یوسف شاہ صاحب کے مزار پر فاتح خوانی بھی کی اور بعد میں آزاد کشمیر کے دارالحکومت کی تعمیر و ترقی دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا''۔

روزنامہ ''جنگ'' اور ''پاکستان ٹائمز'' میں بھی یہ خبر شائع ہوئی اور دونوں اخبارات نے میری وہ تصویریں بھی شائع کردیں جو منگلا ڈیم دیکھتے ہوئے لی

گئی تھیں۔

اس دن شام کو یہ معلوم ہوا کہ چچا عبدالرحیم صاحب لاہور سے ایبٹ آباد آئے ہیں۔اس لیے ہم ان سے ملنے کے لیے گئے۔ چچا رحیم کے ساتھ بہت دیر تک پاکستان کی سیاسی حالت اور صدر ایوب کی تازہ ترین تقریر کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ چچا جان کا خیال تھا کہ صدر نے دانشمندی، تدبر اور دور اندیشی کا ثبوت دے کر مخالف لیڈروں کو بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ صدر کا فیصلہ دانشمندی یا دریادلی سے زیادہ مجبوری کی پیداوار ہے چچا رحیم کی باتوں سے معلوم ہورہا تھا کہ وہ صدر کو ذاتی طور پسند کرتے ہیں۔ انکے خیال میں صدر ایوب بڑا قابل، مخلص اور اول درجے کا سیاستدان ہے۔ اُنہیں ان سے صرف یہ شکایت تھی کہ وہ اپنے بیٹوں اور دامادوں کو قابو میں نہ رکھ سکے کہ جن کی وجہ سے صدر کو بدنام ہونا پڑا۔ اس موضوع پر کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔لیکن بالآخر کشمیر کا ذکر آہی گیا اور اسکے ساتھ ہی چچا رحیم کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی۔ وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور ساتھ والے کمرے میں سے ایک کاغذ اٹھا کر لے آئے۔

"یہ میرا وصیت نامہ ہے اور میں نے اسے تمہارے لیے محفوظ کردیا ہے"۔ چچا جان نے کاغذ کا ایک ورق میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا میں نے پڑھنا شروع کردیا اور مجھ پر رقت طاری ہوگئی۔ یہ وصیت نامہ نہیں ایک مجبور اور بے بس روح کی آواز تھی جو جسم کی قید سے آزاد ہونے کے بعد بھی اپنے وطن لوٹنے کے لیے بے چین تھی۔ یہ صرف مولوی عبدالرحیم کی آواز نہیں تھی اپنے وطن سے دُور اُن ہزاروں غریب الوطنوں کی پکار تھی جو زندگی سے مایوس ہونے کے بعد اب موت کے انتظار میں بیٹھے ہیں کہ شاید ہندوستان اور

پاکستان کی حکومتوں کو لاشوں کی نقل و حرکت پر کوئی اعتراض نہ ہو۔ مولوی صاحب کا یہ وصیت نامہ حرف بحرف نقل کرر ہا ہوں کہ ان کی قلبی کیفیت کا کچھ اندازہ ہو جائے، اسے پڑھتے ہوئے اس بات کو ذہن میں رکھئے کہ یہ صرف مولوی صاحب کا وصیت نامہ نہیں۔ ان اٹھارہ ہزار کشمیریوں کا وصیت نامہ ہے، کہ جو اپنی موت کے بعد بھی اپنے وطن لوٹنے کے لیے بے چین اور بے قرار ہیں۔

وصیت نسبت اُس امر کے کہ میری نعش پاکستان میں امانت رہے اور میری آخری آرام گاہ بمقام سرینگر ہو

بہ تقاضائے عمر، محنت اور قانون فطرت میں اس دارافانی سے اپنی رحلت کا وقت قریب تر دیکھ رہا ہوں۔ میری تمنا یہ تھی کہ میرا یہ وقت کشمیر کے اُسی مقام پر مجھے نصیب ہو جہاں میں نے اپنے والد مرحوم و مغفور کو اپنے ہاتھوں سے بمقام برزلہ متصل بنگلہ رہائشی سپرد خاک کیا تھا، بد قسمتی سے موجودہ حالات میں اس ارادہ کی تکمیل ممکن معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن شمیم احمد شمیم جو کہ میرے ایک شفیق بھائی ایم محمد یعقوب صاحب مرحوم کا فرزند رشید ہے اسے پاکستان میں دیکھ کر اور مل کر مجھے انتہائی خوشی ہوئی۔ مجھے شمیم صاحب کو دیکھ کر اور مل کر اپنے شفیق بھائی کے بہت سے ایسے مواقعہ یاد آئے جب کہ وہ اپنی کمزوری ناتوانی اور خرابی صحت کے باوجود مجھے خوش دیکھنا چاہتے تھے اور مجھے آسودہ حال دیکھ کر اُنہیں اپنے سب درد و دکھ بھول جاتے تھے۔

مجھے شمیم احمد شمیم کو دیکھ کر اور ان کی ذہنی اور قلبی کیفیت کا مطالعہ کر کے یہ یقین ہوا ہے کہ آپ بہت سی اُن عمدہ خصائل کے علمبردار ہیں جو اُن کے اپنے والد اور دادا کے پاک نفوس میں پائی جاتی تھیں۔ خدا کرے کہ شمیم صاحب

اپنی ان صلاحیتوں سے استفادہ کر کے اپنے والد اور دادا کے نام کو کشمیر کی تاریخ حریت کے زریں باب میں زندہ رکھے اور اُس شمع آزادی کو جو کہ اُن کے دادا اور میرے والد مرحوم مولانا مولوی محمد عبداللہ صاحب نے کشمیر میں درس قرآن کے ذریعہ روشن کی وہ اس شمع کی روشنی کبھی بجھنے نہ دیں۔ میں اس ہونہار فرزند سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ میری موت پاکستان میں ہونے کے بعد وہ حتی الامکان کوشش کرے کہ میری نعش سرینگر کے اُس مقام پر سپرد خاک ہو۔ جہاں میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے والدِ بزرگوار کو سپرد خاک کیا ہے۔ میں اپنے گھر کے افراد سے بھی متمنی ہوں کہ وہ پاکستان کے کسی مقام پر چاہے وہ ایبٹ آباد ہو یا لاہور، کشمیر کی آزادی کے وقت تک یا اس وقت تک جب کہ شمیم صاحب اس قابل ہوں کہ وہ پاکستان آکر میری نعش کو سرینگر لے جاسکیں، بطور امانت رکھیں۔ یہ میری اپنی زندگی میں ایک وہ خواہش ہے جس کی تکمیل میں شمیم احمد شمیم کے ہاتھوں سے پورا ہونے کا متمنی ہوں۔ والسلام۔

(عبد الرحیم حال، مقیم کاشانہ رحیم، لنک روڈ، ایبٹ آباد، مورخہ ۲۹ رجنوری ۱۹۹۶ء)

ایبٹ آباد میں پروفیسر عبدالعزیز صاحب بھی قیام رکھتے ہیں۔ پروفیسر صاحب سوپور کے علاقے کے رہنے والے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کی لڑائی کے وقت ایس پی کالج میں پروفیسر تھے۔ اسی ہنگامے میں پاکستان میں پہنچ گئے اور وہاں کشمیریوں کے لیڈر ہوگئے۔ اس وقت آزاد کشمیر میں کونسلر ہیں۔ بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ انہیں ایبٹ آباد میں میری آمد کا علم ہوا تو فوراً تشریف لائے اور بغیر کسی رسمی تعارف کے مجھ سے، اس درجہ محبت اور خلوص کا اظہار کیا کہ جیسے پورے بیس برس سے میرے ہی انتظار میں بیٹھے ہوں۔ عزیز صاحب

کچھ ڈرپوک سے آدمی ہیں۔ اس لیے دائیں بائیں نظر ڈال کر بات کرتے ہیں۔ بات کیا کرتے ہیں، سرگوشی کر لیتے ہیں، کہنے لگے آپ چائے میرے ساتھ ضرور پی لیجئے، میں نے کہا ضرور پیئیں گے اور دوسرے دن میں چچا رحیم اور غلام محی الدین کو لے کر پروفیسر صاحب کے ہاں پہنچ گیا۔ پروفیسر صاحب نے احتیاطاً طاہر سرخیلی نمائندہ اخبار ''جنگ'' کو بھی مدعو کیا تھا۔ طاہر صاحب صدر ایوب کی کنونشن مسلم لیگ کے ممبر ہیں اور پروفیسر عزیز بھی صدر کے حامیوں میں سے تھے۔ وہ صدر کی حمایت ہی نہیں، ان کی وکالت بھی کر رہے تھے۔ بات چیت کا سلسلہ چل پڑا تو سرخیلی صاحب نے پاکستان میں ہونے والے ہنگاموں پر بھی اظہار خیال کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ بغاوت صرف شہروں تک محدود ہے اور دیہات میں صدر ایوب اب بھی بہت مقبول ہیں۔ سرخیلی صاحب کے خیال میں اگر آج بھی بالغ رائے دہی کے مطابق عام انتخابات عمل میں لائے جائیں تو صدر ایوب بھاری اکثریت سے جیت جائیں گے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ دیہات میں کنونشن مسلم لیگ کی تنظیم بہت مضبوط ہے۔ میں نے سرخیلی صاحب کے تجزیئے سے اختلاف کیا لیکن پروفیسر عزیز صاحب ان کی حرف بحرف تائید کر رہے تھے۔ انہوں نے صدر کی تعریف میں ایک اور نکتہ پیدا کر لیا اور وہ یہ کہ صدر کا وجود ہندوستان کے لیے غنیمت ہے۔ ان کے خیال میں صدر کے خلاف پاکستانی سیاستدانوں نے اس لیے بھی ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے کہ وہ کشمیر کا ایک آبرومند سمجھوتہ چاہتے ہیں۔ اپنے ہی دعویٰ کے ثبوت میں انہوں نے آزاد کشمیر کی کونسل میں خود اپنی ہی تقریر کا حوالہ دیا کہ میں نے ایسا کہا تھا۔ میں نے پروفیسر صاحب سے دریافت کیا کہ آپ نے ایک ایسی کونسل کا ممبر بننا کیوں گوارا کر لیا جو کہ ایک توہین آمیز ایکٹ کی پیداوار ہے۔

تو پروفیسر صاحب نے آزاد کشمیر کی سیاست پر سیر حاصل تبصرہ کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی، کہ موجودہ حالات میں یہ بہترین حکومت ہے۔ میں نے یہ دریافت کیا کہ ایکٹ ۱۹۶۸ء کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے اور یہ کہ آزاد کشمیر کے لوگوں کو ان کے جمہوری حقوق سے کیوں محروم کر دیا گیا ہے تو فرمایا:

''وہاں اس لیے جمہوریت نہیں ہے کہ ہم لوگ اس قابل نہیں ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ابھی چار سال قبل وہاں ایک محکمے میں تین لاکھ روپے کا غبن ہوا تھا۔ ہم لوگوں نے تو اس حکومت کا ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے اور اگر حکومت پاکستان یہ ذمہ داری خود نہ سنبھالتی، تو نہ معلوم ہم کیا سے کیا کر دیتے''۔

میں پروفیسر صاحب کی اس منطق سے متاثر نہ ہوا اور میں نے اس اندازِ فکر سے نہ صرف اختلاف کیا، بلکہ اس کے خلاف وہیں احتجاج بھی کر دیا۔ چچا رحیم اور سرخیلی صاحب نے مجھ سے اتفاق کیا۔ شام بہت دیر تک چائے اور گفتگو کا سلسلہ جاری رہا اور اس کے بعد ہم عزیز صاحب سے رخصت ہو گئے، لیکن میں آپ کو یہ کہنا بھول گیا کہ چائے بے حد پُر تکلف اور مزے دار تھی! شام کو میں اور غلام محی الدین پاکستانی فلم ''آوارہ'' دیکھنے گئے۔ فلم بے حد بور تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ بیس بائیس سال پرانا فلم ہے۔ حالانکہ صرف چار سال پہلے بنا تھا۔ تکنیکی اعتبار سے پاکستانی فلمی صنعت ہمارے ہاں کے مقابلے میں بہت پسماندہ اور Primitive ہے ایک پاکستانی فلمی رسالے میں، میں نے ایک مضمون پڑھا کہ جس میں اس بات کی شکایت کی گئی تھی کہ پاکستانی فلم ساز ہندوستانی فلمی گیت معمولی سی ترمیم کے بعد پاکستانی فلموں میں استعمال کرتے ہیں۔ یہی بات فلمی کہانیوں کے متعلق بھی صحیح ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ شکایت کہاں تک درست ہے کیونکہ مجھے ''آوارہ'' کے بغیر

کوئی دوسری فلم دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ ''آوارہ'' میں اداکاری کا معیار خاصا تھا لیکن کہانی بہت پرانی تھی۔ پاکستانی اداکار کمال شکل وصورت سے راجکپور سے بے حد ملتا جلتا ہے۔ رات کا کھانا غلام محی الدین کے ساتھ کھا کر میں سونے کے لیے چچا رحیم کے پاس گیا۔ وہ اتنی بڑی کوٹھی میں اکیلے رہ رہے تھے۔ خود کھانا پکاتے اور برتن صاف کرتے تھے۔ خلوت پسند تو وہ شروع سے ہی تھے۔ لیکن معلوم ہوا کہ کچھ عرصے سے بالکل ہی تنہا رہنا پسند کرتے ہیں۔ رات دو بجے تک اُن سے باتیں ہوتی رہیں۔ میری آنکھوں کی نیند بھی نہ معلوم آج کہاں اڑ گئی تھی۔ چچا جان بار بار کہتے کہ شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو، میں انہیں تسلی دیتا کہ وہ اس قدر مایوس کیوں ہیں، خدا نے چاہا تو پھر کبھی ملاقات ہوگی۔ انہیں اپنی بیماری کا شدید احساس تھا کہنے لگے ''دمہ کی بیماری بہت موذی بیماری ہے اور مجھے یقین نہیں کہ میں زیادہ دیر زندہ رہ سکوں گا''۔

میری آنکھ کس وقت لگی، مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ مجھے صرف یہ یاد ہے کہ صبح سات بجے کے قریب چچا جان مجھے جگا رہے تھے کہ بیٹا! اٹھو چائے پیو، دیر ہوگئی ہے اور پھر جب وہ مجھے رخصت کرنے کے لیے دروازے تک آئے، تو ان کی بوڑھی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی جھلملا رہے تھے۔

❁❁❁

15

صدر ایوب کی مخالف لیڈروں سے بات چیت کرنے کی پیشکش کے باوجود ایجی ٹیشن کی شدت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، کراچی لاہور پشاور اور دیگر شہروں سے ہر روز ہنگاموں کی اطلاعات آ رہی تھیں۔ راولپنڈی میں عورتیں اور وکیل خاص طور پر سرگرم تھے۔ کہیں کہیں صدر ایوب کے حامیوں نے جوابی کاروائی کے طور پر جلوس نکالنے کی کوشش کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ جس روز میں ایبٹ آباد سے راولپنڈی آ رہا تھا، راستے میں صدر ایوب کے صاحبزادے کو پٹھانوں کے ایک جلوس کی رہنمائی کرتے ہوئے دیکھا۔ جلوس میں شامل لوگوں کی تعداد ہزار بارہ سو سے زیادہ نہ ہوگی اور یہ صدر ایوب زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ پچھلے پندرہ بیس دن میں یہ پہلا موقعہ تھا جب میں نے پاکستان میں صدر ایوب زندہ باد کا نعرہ سنا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس جلوس نے صدر کے خلاف عوامی نفرت اور ردعمل کو زیادہ شدید کر دیا۔ کیونکہ عام لوگوں کو یہ شبہ ہو گیا کہ صدر اپنے بیٹوں کے ذریعے پٹھان اور پنجابی کا فتنہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ راولپنڈی پہنچ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ شہر میں مکمل طور امن ہے اور کھچاؤ کے کوئی آثار نہیں۔ لیکن دوسرے دن مسز نصرت بھٹو تشریف لائیں اور انہوں نے عورتوں کے ایک بہت بڑے جلوس کی رہنمائی کی۔ یہ جلوس تقریباً دو ہزار عورتوں پر مشتمل تھا اور مسز بھٹو پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ کا پرچم اٹھائے ہوئے جمہوریت کے نعرے بلند کر رہی تھیں۔ وہ جگہ جگہ جا کر جلسے اور جلوس منظم کرنے لگی تھیں۔

میں راولپنڈی پہنچا تو معلوم ہوا کہ کراچی سے امان اللہ اور غلام احمد لون کئی بار ٹیلیفون کر چکے ہیں اور انہوں نے کراچی آنے کے لیے اصرار کیا ہے۔ میں نہ امان اللہ کو جانتا تھا نہ لون صاحب کو۔ لیکن صابر صاحب کی زبانی معلوم ہو گیا کہ دونوں گلکار صاحب کے دوست ہیں۔ اور ''خود مختاری'' گروپ سے تعلق رکھتے ہیں۔ صابر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ شریف طارق آئے تھے اور شاید پھر آئیں۔ شریف طارق صاحب عبدالعزیز میر والے محاذ رائے شماری کے صدر ہیں اور ان کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ طارق صاحب ۱۹۶۵ء سے قبل راجوری میں وکالت کرتے تھے، ۶۵ء کی جنگ میں وہ ''آزاد کشمیر'' پہنچ گئے، تو ان کے حریفوں نے ان پر یہ الزام لگایا کہ ''یہ غدار ہے اور یہاں آنے سے پہلے راجوری میں جن سنگھ کا ایک سرگرم کارکن تھا''۔ اس وقت عبدالعزیز میر اور عبدالخالق انصاری کا محاذ ایک تھا۔ اس لیے محاذ رائے شماری نے بحیثیت جماعت کے شریف طارق کا دفاع کیا۔ عدالت میں مشتاق احمد فاروقی نے ان کی زوردار وکالت کر کے انہیں بے گناہ اور معصوم ثابت کر دیا اور ایک مسلمان پر جن سنگھی ہونے کے الزام کا تمسخر اڑایا۔ اس طرح طارق صاحب ''بحال'' ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد محاذ رائے شماری میں تفرقہ پڑ گیا تو عبد العزیز میر نے طارق صاحب کو اپنی جماعت کا صدر بنا دیا۔ اب انصاری اور مشتاق دونوں ہی اپنے کئے پر نادم ہیں اور ان کی یہ کوشش ہے کہ شریف طارق پر غداری اور جن سنگھی ہونے کا الزام ثابت ہو جائے تو اچھا ہے، لیکن اب پانسا پلٹ چکا ہے۔ شریف طارق صاحب کی جماعت انصاری صاحب کی جماعت کے مقابلے میں پاکستانی حکام کی نگاہوں میں زیادہ پسندیدہ ہے۔

۵ر فروری کو میں گلکار صاحب سے ملنے کے لیے گیا تو انہوں نے اطلاع

دی کہ غلام احمد لون کے علاوہ بہت سے دوستوں نے مجھے یہ کام سونپا ہے کہ
میں آپ کو کراچی بھیج دوں، جانے کو تو میرا دل چاہ رہا تھا لیکن اس خیال سے
کہ اب وقت کم رہ گیا ہے اور راولپنڈی سے کراچی کا فاصلہ بھی بہت ہے۔
میں نے کچھ ہچکچاہٹ ظاہر کی گلکار صاحب نے فوراً ٹیلی فون پر لون صاحب کو
اطلاع کردی کہ وقت کی کمی کے باعث میں شاید نہ آسکوں گا۔ کراچی کے
دوستوں نے فوراً راولپنڈی سے کراچی اور واپسی کے لیے ہوائی ٹکٹ دینے کی
پیش کش کی اور اب میرے لیے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ لیکن
میرے پاس کراچی کا ویزا نہیں تھا اور اب چونکہ میں کراچی تک جا ہی رہا تھا،
میں نے سوچا کہ دو ایک دن کے لیے ڈھاکہ سے بھی ہوتا آؤں تاکہ اپنی چچا
زاد بہن سے بھی مل سکوں۔ ویزا فارم حاصل کرنے کے لیے کچہری گیا تو وہاں
ثناء اللہ، شمیم، محمد امین، مختار، غلام الدین وانی اور چودھری نور حسین سے
ملاقات ہوئی۔ یہ سبھی لوگ سیاست سے فارغ ہو کر اب وکالت کر رہے ہیں۔
وانی صاحب نوٹری پبلک ہیں اور انکی اچھی خاصی آمدن ہے۔ ان کی زبانی
معلوم ہوا کہ میرے لیے کراچی اور ڈھاکے کا ویزا ڈپٹی کمشنر کے ہاں سے
نہیں، وزارت امور کشمیر سے بنے گا اور اس کے لیے اسلام آباد جانا پڑے گا۔
اتنے میں میر عبدالعزیز (ایڈیٹر انصاف) بھی تشریف لائے اور میں ان کے
ہمراہ غلام احمد صاحب ترالی، پبلک ریلیشنز آفیسر آزاد کشمیر کے دفتر پر گیا۔ میں
ان سے صاحبزادہ حسن شاہ صاحب کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا تھا۔
حسن شاہ صاحب کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ سٹیلائٹ ٹاؤن میں ہی رہ
رہے ہیں، لیکن ان کے گھر کا پتہ معلوم نہ تھا۔ ترالی صاحب نے بتایا کہ شاہ
صاحب اسلام آباد یونیورسٹی کے رجسٹرار ہیں اور ان کا دفتر بھی کہیں سیٹلائٹ

ٹاؤن میں ہی ہے۔ ان کے دفتر ٹیلیفون کیا، تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی بچی کی شادی کے سلسلے میں پشاور گئے ہوئے ہیں اور دس دن کے بعد لوٹیں گے، اس لیے ان سے ملاقات کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ میں دراصل حسن شاہ صاحب سے ان کی ہجرت (فرار؟) کی وجوہات جاننا چاہتا تھا۔ وہ یہاں محکمہ تعلیم میں ایک اچھے منصب پر فائز تھے۔ ان کی بیوی بھی لیکچرر تھیں۔ پھر وہ پاسپورٹ پر کچھ دنوں کے لیے پاکستان چلے آئے اور آخر میں یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کی ''ہجرت'' کا فرقہ پرست اخبارات نے بڑا چرچا کیا اور ان سے کئی افسانے منسوب کیئے گئے۔ میں ان کی زبانی تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے کا خواہشمند تھا، لیکن ممکن نہ ہو سکا۔

شام کو ترالی صاحب نے میر عبدالعزیز کے دفتر میں ایک عصرانہ دیا، جس میں صابر صاحب کے علاوہ، غلام الدین وانی، خواجہ عبدالصمد وانی، ایڈیٹر ''کشمیر'' پنڈی میل کے ایڈیٹر، مسٹر شہباز انفارمیشن آفیسر اور میرے ایک عزیز مبارک احمد ڈار بھی مدعو تھے۔ بہت دیر تک کشمیر، ہندوستان اور پاکستان کی سیاست پر گفتگو ہوتی رہی۔ عبدالعزیز میر بڑے زندہ دل اور مرنجان مرنج آدمی ہیں۔ انہوں نے سیاسی لیڈروں اور نام نہاد لیڈروں کے لطیفے سنا سنا کر خوب ہنسایا۔ رات میں گلکار صاحب کے ایک دوست غلام احمد ریشی کے ہاں کھانا کھانا تھا اور وہیں سے میں نے کراچی کے دوستوں سے ٹیلی فون پر پہلی ملاقات کی۔ امان اللہ نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے اچھی طرح سے جانتے ہیں اور یہ کہ وہ ایس پی کالج میں میرے ہم جماعت رہ چکے ہیں۔ اُنہوں نے دھمکی دی کہ اگر میں کسی وجہ سے کراچی نہ آسکوں تو کراچی سے ایک قافلہ مجھے ملنے کے لیے پنڈی چلا آئے گا۔ میں ان کے خلوص اور ان کی محبت سے بے حد متاثر ہوا

اور میں نے فیصلہ کیا کہ میں کسی قیمت پر بھی کراچی جاؤں گا۔ لیکن دوسرے دن جب اسلام آباد جاکر ویزا کی درخواست دی تو معلوم ہوا کہ ڈھاکہ کے لیے ویزا ملنا آسان نہیں ہوگا۔ وزارتِ امور کشمیر میں ظفر کامران (انچارج ویزا) نے بتایا کہ ویزا میں دو تین دن لگ جائیں گے۔ انہوں نے وزارت داخلہ سے میری فائل منگوائی، تو معلوم ہوا کہ میرے بارے میں اچھی خاصی فائل موجود ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر میں کچہری کے قریب اتر گیا کہ شمیم صاحب اور وانی صاحب کو ویزا کے سلسلے میں پیش آنے والی دقتوں سے مطلع کردوں۔ میں شمیم صاحب سے بات کر ہی رہا تھا کہ عدالت کے احاطے میں نوجوان لڑکیوں کا ایک گروہ داخل ہوگیا۔ وکیل، موکل سب ان نوجوان لڑکیوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے کہ یاالٰہی ماجرا کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ لڑکیاں بار ایسوسی ایشن کے صدر اسلم حیات کو تلاش کر رہی ہیں۔ اسلم صاحب ساتھ والے عدالت کے کمرے سے باہر آئے۔ تو لڑکیوں نے انہیں چوڑیاں پیش کردیں۔ اس کا مطلب تھا کہ آپ لوگ اب ایجی ٹیشن میں حصہ نہیں لیتے، آپ نے ہمت ہار لی ہے۔ اب آپ چوڑیاں پہن کر گھروں میں بیٹھ جایئے۔ عین اس وقت جب لڑکیاں وکیل صاحبان کو چوڑیاں پہنا رہی تھیں اخباری فوٹو گراف اس واقعہ کی تصویریں لے رہے تھے اور دوسرے دن تمام اخبارات میں یہ تصویریں شائع ہوگئیں۔ وکیل صاحبان کو لڑکیوں کی اس حرکت پر بڑا تاؤ آیا اور انہوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ انہوں نے لڑکیوں کو بتایا کہ پاکستان کی حالیہ بغاوت کا آغاز دراصل وکیلوں نے ہی کیا ہے اور اس کے لیے انہوں نے بڑی قربانی دی ہے، لیکن لڑکیاں بضد تھیں کہ وکیل لوگ

اب عملی تحریک سے الگ ہو گئے ہیں۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ عورتوں کے جلوس پر لاٹھی چارج ہو اور آپ عدالتوں میں بیٹھ کر وکالت میں اپنا وقت ضائع کریں۔ نوجوان لڑکیوں اور وکیلوں میں آدھ گھنٹہ تک بڑی دلچسپ بحث ہوتی رہی اور میں محظوظ ہوتا رہا۔

شام کو شریف طارق صاحب دوبارہ تشریف لائے اور ان سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ طارق صاحب میرپور میں وکالت کر رہے ہیں۔ بڑے شریف آدمی ہیں اور ان کی گفتگو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ محاذ کے صدر زبردستی بنائے گئے ہیں۔

اُنہوں نے مشتاق صاحب کے متعلق شکایت کی کہ وہ پھانسی کے تختے سے بچا کر اب انہیں پھانسی ہی کے تختے پر لٹکانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ سیاست کے یہی آداب اور یہی قدریں ہوتی ہیں۔ اس میں حیران یا ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔ رات کو غلام الدین وانی نے کھانے کی دعوت دی تھی۔ وانی صاحب پونچھ ہاؤس میں رہ رہے ہیں اور ان کا شمار کھاتے پیتے گھرانوں میں ہوتا ہے۔ دعوت پر تکلف تھی۔ ثناءاللہ شمیم اور صابر صاحب بھی مدعو تھے۔ گفتگو کا سلسلہ درگا پرشاد در سے ہوتا ہوا مولوی محمد فاروق پر آ کر ختم ہو گیا۔ درمیان میں شیخ صاحب، صادق صاحب، بیگ صاحب، مولانا مسعودی اور صوفی محمد اکبر سبھی کا ذکر آ گیا۔ ٹیلی ویژن پر اپالو ۸ کا فلم دکھایا جا رہا تھا اور مجھے یہ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ٹیلی ویژن سے کتنے اہم کام لئے جا سکتے ہیں اور ہماری ریاست میں اس کی کتنی سخت ضرورت ہے۔ دوسرے دن ویزا کے بارے میں دریافت کرنے کے لیے پھر اسلام آباد جانا پڑا۔ ظفر کامران صاحب بڑی خندہ پیشانی سے ملے، لیکن انہوں نے معذرت کی کہ

ابھی ویزا تیار نہیں ہے۔ دو ایک دن لگ جائیں گے۔ واپسی پر انڈین ہائی کمیشن پر گیا، کہ یہ معلوم کروں کہ ہائی کمشنر صاحب تشریف لائے ہیں یا نہیں۔ وہاں پریس اتاشی نریش دیال صاحب سے ملاقات ہوئی، دیال صاحب نے بتایا کہ نئے ہائی کمشنر بی کے آچاریہ آج آنے والے ہیں۔ بیس پچیس دن سے ایک بھی ہندوستانی اخبار نہیں دیکھا تھا۔ میں نے دیال صاحب سے کہا کہ مجھے پچھلے دو ہفتوں کے اخبارات دکھایئے، اُنہوں نے کہا سبھی اخبارات تو نہیں ہیں صرف انڈین ایکسپریس ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو بتایا کہ دلی اور راولپنڈی کے درمیان ہوائی ڈاک کا سلسلہ نہ ہونے کی وجہ سے ہفتے میں صرف ایک بار ڈاک آتی ہے۔ دیال صاحب نے اصرار کیا کہ میں ہائی کمشنر صاحب سے ملے بغیر واپس نہ جاؤں اور انھوں نے کل کے لیے وقت بھی مقرر کر لیا۔

اب میں راولپنڈی سے واپس روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگا۔ پیر مقبول گیلانی سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ جانے سے پہلے ضرور مل لوں گا۔ اس لیے میں ان کے ہاں پہنچ گیا۔ وہ ابھی تک صاحب فراش تھے، لیکن پہلے سے بہتر تھے۔ میں نے کہا کہ میں واپس جا رہا ہوں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتایئے یہ سن کر وہ بے حد جذباتی ہو گئے اور ان کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہنے لگے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے وطن لوٹنے کے ذکر سے انہیں اپنی غریب الوطنی کا احساس شدت سے ستانے لگا تھا۔ کہنے لگے کہ اس بڑھاپے اور ناتوانی کے عالم میں اپنے عزیز و اقارب سے دور پڑا ہوں۔ میری بیوی ایک عرصے سے یہاں آنے کی کوشش کر رہی ہے، اُسے اجازت نہیں ملتی۔ میں ایک بار اُس کشمیر کو دیکھنے کی حسرت لیے بیٹھا ہوں، کہ جس کی مٹی

میں ہزاروں یادیں دفن ہیں۔

اس کے بعد شیخ صاحب، بیگ صاحب اور صادق صاحب کے نام سلام دیا۔ صادق صاحب کا ذکر کرتے ہوئے پیر صاحب نے کہا کہ میری لڑائی بخشی غلام محمد کے ساتھ تھی اور اسی کی وجہ سے مجھے کشمیر چھوڑنا پڑا۔ صادق صاحب کے لیے میرے دل میں بڑی عزت ہے اور جب سے وہ برسر اقتدار آئے ہیں وہاں سے موصول ہونے والی اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ غنڈہ گردی اور ظلم و ستم کا وہ دور جو بخشی نے شروع کیا تھا، ختم ہو گیا ہے۔ ہم نے تو اپنے ساتھیوں سے کہا ہے کہ صادق کے ساتھ ہمارے سیاسی اختلافات ہیں لیکن اگر بخشی اور صادق میں سے کسی کا انتخاب کرنا تو ہو تو صادق کی حمایت کرنا چاہیے۔

اس کے بعد پیر صاحب نے اپنی بیماری کا ذکر کیا اور کہا کہ صدر کا ذاتی معالج ان کا علاج کرتا ہے اور علاج معالجے کے سلسلے میں انہیں ہر قسم کی سہولیات مہیا ہیں۔ پیر صاحب نے شکایت کی سٹیٹ پیپلز کنونشن کے سلسلے میں بھیجے گئے دعوتی کارڈوں نے یہاں بہت سے لوگوں کو بدگمان کر دیا ہے۔ کیونکہ کچھ لوگوں کے نام کارڈ بھیجے گئے تھے اور بعض اہم لوگوں کے نام کارڈ نہیں آئے تھے۔

پیر صاحب سے رخصت ہو کر میں غلام الدین وانی صاحب کے ہمراہ بان والا بازار کے نوبہار یہ ہوٹل میں گیا۔ جہاں محاذ رائے شماری (میر عبد العزیز گروپ) کی طرف سے میرے اعزاز میں ایک عصرانہ دیا گیا تھا۔ میزبانوں نے خالص کشمیری انداز میں میرا سواگت کیا۔ مجھے پھولوں کے ہار پہنائے اور بڑی پُرتکلف چائے سے میری تواضع کی۔ میر عبد العزیز، شریف طارق، کرناہی صاحب کے علاوہ ایک عبداللہ ڈار سے بھی ملاقات ہوئی۔ بڑی

بڑی مونچھوں والا یہ آدمی پہلی نظر میں مجھے پہلوان لگا، لیکن معلوم ہوا کہ یہ محاذ کے نائب صدر ہیں۔ عبداللہ ڈار صاحب سوپور یا ہندوارہ کے رہنے والے ہیں۔ بڑے باتونی اور تیز طرار قسم کے آدمی ہیں۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کشمیر کی سیاست پر تبصرہ فرمایا، بعض دوستوں نے مجھ سے کچھ سوالات کئے اور کچھ لوگوں نے سوالات پوچھنے کے بہانے تقریریں کر ڈالیں، یہاں سے فراغت ہوئی تو اللہ رکھا ساغر کے ہاں پہنچے۔ ساغر صاحب اب عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ انہیں پرنٹنگ پیپر کی ایجنسی مل گئی ہے اور وہ اب اسی کاروبار میں مشغول ہیں۔ ان دنوں بیمار تھے، ان کی ٹانگ میں چوٹ آئی تھی اور کئی ہفتوں سے صاحبِ فراش تھے۔ کاغذ کی اونچی اونچی دیواروں سے ہو کر ہم اس کمرے میں پہنچے کہ جہاں وہ آرام کر رہے تھے۔ غلام الدین وانی صاحب نے میرا تعارف کرایا، تو ساغر صاحب بڑی محبت سے ملے۔ یہ ان کی اور میری پہلی ملاقات تھی۔ اس سے پہلے میں نے ان کا نام ہی سنا تھا!

ساغر صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ غائبانہ تو آپ کا پہلے سے تعارف ہے کبھی کبھی اخباروں میں آپ کا ذکر آتا ہے۔ آپ سے ملاقات کی بھی خواہش تھی لیکن میں کئی ہفتوں سے بستر پر پڑا ہوں، اس لیے کہیں ملاقات نہ ہو سکی''۔

اس کے بعد انہوں نے نذیر حسین سمنانی کے والد اور گردھاری لال آنند کے متعلق دریافت کیا، کہ وہ کہاں ہیں اور کیسے ہیں؟ میرے پاس وقت کم تھا، اس لیے میں نے ان کی باتیں سننے پر ہی اکتفا کیا، وہ بڑی شستہ اردو بولتے ہیں، ان کی گفتگو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کشمیر اور پاکستان کی سیاست پر ان کی

گہری نظر ہے۔ پاکستان کی موجودہ سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے ساغر صاحب نے کہا کہ ''صدر ایوب نے پاکستان کی اینٹ سے اینٹ بجادی ہے۔ یہ آدمی بہت ہی لالچی اور خودغرض ہے اور خاص طور پر کشمیر کے متعلق تو بہت ہی Non Serious ہے، اُس نے ابھی حال ہی میں ایک ملاقاتی سے کہا تھا کہ کشمیر کے متعلق ہم نے جنگ بھی کی، اُس سے بھی کچھ حاصل نہ ہو، اب لوگ مجھ سے کیا توقع رکھتے ہیں، ایر مارشل اصغر خان شاید کچھ بہتر آدمی ثابت ہوا، کیونکہ وہ کافی سنجیدہ اور نکتہ شناس آدمی معلوم ہوتا ہے''۔ ''مسٹر بھٹو کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے'' میں نے دریافت کیا۔

''وہ تو بچہ ہے، اور بچگانہ باتیں کرتا ہے، پاکستانی سیاست میں اس کا کوئی مستقبل نہیں، اس شخص نے طفلانہ حرکتیں کرکے پاکستان میں اپنی Image خراب کردی ہے''۔ ساغر صاحب نے فیصلہ دیا۔ اس کے بعد ساغر صاحب نے خاص طور پر مولانا مولوی محمد فاروق کی شخصیت، ان کی سیاست اور ان کے اثر ورسوخ کے بارے میں دریافت کیا۔ پاکستان میں اکثر لوگوں نے اس نوجوان رہنما کے بارے میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں بہت سے لوگ فاروق صاحب سے غائبانہ عقیدت رکھتے ہیں۔

شام کو غلام نبی گلکار کے ہاں دعوت تھی، وہاں احمد سعید ہمدانی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ہمدانی صاحب شکل وصورت سے مولوی لگتے ہیں۔ لیکن ان کی گفتگو خاصی ترقی پسند اور غیر مولویانہ تھی۔ ان کے خیال میں کشمیر سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو پاکستان آنے کی اجازت مل جانا چاہیے تا کہ وہاں کے لوگ اپنی آنکھوں سے پاکستان کو دیکھ کر کوئی رائے قائم کرسکیں۔ ہمدانی صاحب کے خیال میں آمد ورفت پر پابندیوں نے بہت سی غلط فہمیاں یا خوش

فہمیاں پیدا کر دی ہیں اور انہیں صرف اسی صورت میں دور کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان اور کشمیر کے درمیان لوگوں کو بلا روک ٹوک آنے جانے کی اجازت ہو۔

اس کے بعد غلام نبی گالکار سے آزاد کشمیر اور خود مختار کشمیر کے سوال پر بحث ہوئی۔ بحث کیا ہوئی، گالکار صاحب نے اس کی اہمیت، افادیت اور امکانات پر ایک مفصل تقریر کر ڈالی۔

16

راولپنڈی پہنچتے ہی میں نے صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان کو خط لکھا تھا، کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں اور کشمیر کے سوال پر پاکستان کا موقف سمجھنے کا خواہشمند ہوں۔ صدر نے میرے خط کا پورے آٹھ دن بعد جواب دیا اور لکھا کہ ''مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوگی، لیکن میں ان دنوں نہایت مصروف ہوں۔ میری خواہش ہے کہ آپ خواجہ شہاب الدین اور الطاف گوہر سے ضرور ملیں''۔ صدر کی مصروفیات کا مجھے خود بھی اندازہ تھا۔ لیکن مجھ سے نہ ملنے کی وجہ صرف ان کی بے پناہ ''مصروفیت'' نہیں تھی۔ میرا اپنا اندازہ ہے کہ وہ اس نازک مرحلے پر کچھ نازک سوالات کا جواب دینا نہیں چاہتے تھے اور خاص طور پر ایک ہندوستانی اخبار نویس کے سوالات کا، اسلیے انہوں نے خواجہ شہاب الدین اور الطاف گوہر کا نام تجویز کیا تھا۔ خواجہ شہاب الدین کا تعلق مشرقی پاکستان سے ہے۔ وہ صدر ایوب کی کابینہ کے سب سے سینئر، معتمد اور معتبر وزیر تھے اور ان کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ پاکستان بننے سے اب تک ہر کابینہ میں وزیر رہ چکے ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ پاکستان کے گردھاری لعل ڈوگرہ ہیں۔ (ڈوگرہ صاحب ۱۹۴۷ء میں شیخ صاحب کے ساتھ کرسی پر بیٹھے تھے، ابھی تک بدستور براجمان ہیں) الطاف گوہر صاحب صدر ایوب کے وقت میں انفارمیشن سیکرٹری تھے۔ صدر کے خاص آدمی سمجھے جاتے تھے۔ پاکستان میں عام طور پر انہی کو صدر ایوب کی خودنوشت سوانح ''فرنڈس ناٹ ماسٹرس'' کا مصنف سمجھا جاتا ہے۔ ایک پاکستانی اخبار نویس نے مجھے بتایا کہ

پچھلے چھ سات سال سے پاکستان پر صرف یہی تین آدمی حکمران ہیں۔ صدر ایوب، خواجہ شہاب الدین اور الطاف گوہر۔ اس کے بعد میں نے خواجہ شہاب الدین کے بارے میں دریافت کیا، تو معلوم ہوا، کہ وہ صدر ایوب کے ساتھ ڈھاکہ گئے ہوئے ہیں۔ الطاف گوہر بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ان دنوں ڈھاکہ میں مرکزی اسمبلی کا اجلاس منعقد ہو رہا تھا۔ اس لیے ان کے جلد واپس آنے کا امکان نہ تھا۔ ادھر میں نے ۱۱ر فروری کو لاہور جانے کا پروگرام طے کر لیا تھا، تاکہ وہاں سے کراچی کے لیے روانہ ہوسکوں۔

ایک دوست نے اے۔ بی۔ اعوان کا ذکر کیا اور کہا کہ اے۔ بی۔ اعوان سے مل لو۔ طبیعت خوش ہو جائے گی۔ میں نے ''آزاد کشمیر'' میں اعوان صاحب کا نام کئی بار سنا تھا۔ انہیں آزاد کشمیر اور پاکستان میں مقیم کشمیری اپنا اصل بادشاہ کہتے تھے وہ اس وقت پاکستان کے ہوم سیکرٹری تھے اور آزاد کشمیر پر ان ہی کا سکہ چلتا تھا۔ منسٹری آف کشمیر افیئرس کا انچارج ایک جوائنٹ سیکرٹری ہوتا ہے۔ لیکن اس محکمے کا سیکرٹری، ہوم سیکرٹری ہوتا ہے اور اعوان صاحب کئی سال سے اس عہدے پر فائز تھے۔ وہ پولیس کے انسپکٹر جنرل رہ چکے ہیں اور پاکستان بھر میں اپنی قابلیت اور غیر معمولی صلاحیتوں کے لیے مشہور ہیں (تھے) میرے جن دوست نے ان کا ذکر کیا ان کے خیال میں مسٹر اعوان سے ملے بغیر پاکستان اور آزاد کشمیر میں مقیم کشمیریوں کی صحیح حالت کا اندازہ ممکن نہیں تھا۔ اس لیے میں دوسرے دن مسٹر اے۔ بی۔ اعوان سے ملنے کے لیے اسلام آباد گیا۔ اسلام آباد میں ان کا دفتر اس عمارت میں واقع ہے کہ جس کی نچلی منزل میں منسٹری آف کشمیر افیئرس کا دفتر ہے۔ میں نے اپنا کارڈ بھیجا، تو مجھے فوراً ہی اندر بلوا لیا گیا۔ اعوان صاحب نے ایک محتاط سی

مسکراہٹ کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا۔ جب وہ ہاتھ ملانے کے لیے کھڑے ہو گئے تو میں نے ان کی بلند قامتی کا اندازہ کرلیا۔ ان کا قد چھ فٹ سے کم نہ ہوگا، چہرے کا رنگ گندمی ہے، مگر سیاہی مائل۔ آواز میں ایک بھاری پن جس سے ان کی پوری شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ رسمی گفتگو کے بعد میں نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

''میں نے جناب ارشد حسین سے یہ سوال پوچھا تھا کہ پاکستان نے ''آزاد کشمیر'' کو جمہوری حقوق سے کیوں محروم رکھا ہے۔ تو انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس سوال کا جواب وزیرِ امور کشمیر سے حاصل کرلوں، وہ یہاں نہیں ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ میرے اس سوال کا جواب دیں۔ کیونکہ پاکستان میں ایک ماہ قیام کے بعد مجھے اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا ہے''۔ میں نے اعوان صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ وہ کچھ سوچنے لگے اور سوچتے ہوئے ان کے ماتھے پر کچھ شکنیں ابھر آئیں، کچھ دیر بعد انہوں نے کہا:

''میں آپ کے سوال کا جواب دے سکتا ہوں اور میرے پاس اس سوال کا جواب ہے، لیکن میں آپ کے اس سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ اس لیے کہ آپ ایک غیر ملکی اخبار نویس ہیں اور آپ کو یہ سوال پوچھنے کا کوئی حق نہیں ہے''۔ اعوان صاحب نے نہایت سنجیدگی سے کہا وہ مجھے اس درجہ مرعوب کرنا چاہتے تھے، کہ میں کوئی دوسرا سوال نہ پوچھوں۔ میں نے ان کا جواب سنتے ہی اپنی حکمت عملی مرتب کردی۔ یہ آدمی Bully ہے اور اس سے نپٹنے کے لیے Bully بننا پڑے گا۔

''جہاں تک میرے حقوق کا تعلق ہے''۔ میں نے اعوان صاحب سے

مخاطب ہوکر کہا۔ ''میں اپنے حقوق سے واقف ہوں۔ آپ میرے سوال کا جواب دینے سے انکار کر سکتے ہیں۔ لیکن میرے سوال پوچھنے کے حق سے مجھے محروم نہیں کر سکتے اور ہم اخبار نویس لوگ تو سوال پوچھ پوچھ کر اپنی روزی کماتے ہیں۔ اس لیے ہم سوال پوچھنے سے کیسے باز آسکتے ہیں۔ ویسے مجھے آپ کے انکار میں اپنے سوال کا جواب مل گیا ہے''۔

اس دوران میں چائے آ گئی۔ اور ایک لمحے کے لیے گفتگو کا سلسلہ رُک گیا۔ میں مسٹر اعوان کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ انہیں میری گستاخی پر بے حد غصہ آرہا تھا، لیکن وہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ انہوں نے میری گستاخی کا کوئی نوٹس نہیں لیا ہے۔

''آپ اجازت دیں، تو میں ایک اور سوال پوچھ لوں؟'' میں نے ایک مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا، ''بڑے شوق سے، لیکن جیسا کہ آپ نے خود کہا ہے، میں اس کا جواب دینے کے لیے مجبور نہیں ہوں'' مسٹر اعوان نے نہایت روکھے لہجے میں جواب دیا۔

''میں یہاں بہت سے کشمیریوں سے ملا ہوں، اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ لوگوں نے انہیں بڑی بڑی جائیدادیں الاٹ کردی ہیں اور جس کے پاس وہاں پھوٹی کوڑی نہ تھی، وہ یہاں لاکھوں کی جائیداد کا مالک بن گیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ ذہنی طور پر ناآسودہ ہیں۔ اس لیے کہ بحیثیت مجموعی انہیں یہ احساس ہے کہ آپ لوگ ان پر بھروسہ نہیں کرتے۔ بہت سے ایسے کشمیری لیڈر جو کشمیر میں پاکستان سے الحاق کی تحریک کے سربراہ تھے۔ یہاں گمنامی اور ذلت کی زندگی گذار رہے ہیں۔ ان کا کوئی سیاسی وجود نہیں، یہی نہیں کچھ لوگوں نے مجھ سے شکایت کی ہے، کہ پاکستانی سی آئی ڈی ان کا

تعاقب کرتی پھرتی ہے۔ میرے بعض رشتہ داروں نے مجھ سے کہا کہ سی آئی ڈی اور پولیس والے ان کا قافیہ تنگ کئے ہوئے ہیں۔ مجھے اس کی شکایت نہیں لیکن میں اس کا سبب جاننا چاہتا ہوں۔ کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو اپنا گھر بار چھوڑ کر پاکستان کی جنت میں آئے تھے۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ پاکستان کے دیوانے پاکستان کی سرزمین پر پہنچتے ہی اس کے دشمن بن جائیں۔ اگر ہندوستانی حکمران ہم پر بھروسہ نہیں کرتے تو اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ وہ ہندو ہیں اور ہم مسلمان۔ لیکن مسلمان بھی مسلمان کا بھروسہ نہ کریں، اس میں کون سا راز پوشیدہ ہے''؟ میں نے ایک ہی سانس میں بہت سے سوالات کر ڈالے اور جتنی دیر میں بول رہا تھا، اعوان صاحب میز پر پڑے پیپر ویٹ کے ساتھ کھیلتے رہے۔ میں خاموش ہوا تو انہوں نے اپنی ٹائی کی گرہ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

''مسٹر شمیم'' اب کی بار انہوں نے انگریزی میں کہنا شروع کیا ''پاکستان میں مقیم کشمیریوں کے بارے میں یہ سوالات پوچھنے کا آپ کا Locus Standi کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ آپ کے رشتہ دار اور دوست ہیں، لیکن یہ پہلے پاکستانی ہیں اور پھر آپ کے رشتہ دار یا دوست، ان کے بارے میں آپ کی غیر معمولی دلچسپی اور تجسس نامناسب نہیں، تو غیر متعلق ضرور ہے۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے اور ہم اپنی ذمہ داری کو نبھاتے آئے ہیں''۔ مسٹر اعوان نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ایک ایک لفظ تول کر بول رہے ہیں۔ ان کا رویہ بڑا تحکمانہ تھا اور مجھے حیرت ہے کہ انہوں نے ایسا رویہ کیوں اختیار کیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجھ پر اپنی شخصیت کا رعب بٹھانا چاہتے تھے۔ انہوں نے ایک بار بھی مجھے مطمئن کرنے کی مخلصانہ کوشش نہیں کی۔

''اعوان صاحب! اگر مجھے اپنے ہم وطنوں اور رشتہ داروں کے بارے میں دلچسپی ظاہر کرنے کا Locus Standi نہیں ہے، تو میں یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ کشمیر کے چالیس لاکھ عوام کے غم میں کیوں گھلے جارہے ہیں۔ آپ کا اپنا Locus Standi کیا ہے؟'' میں نے نہایت اطمینان سے پوچھا اور اس خیال سے پوچھا کہ اس کے بعد اعوان صاحب مجھے اپنے کمرے سے نکل جانے کا حکم دیں گے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ان کے لہجے اور رویہ میں ایک خوشگوار تبدیلی آگئی۔

''برا نہ مانئے، آپ تو وکیلوں کی طرح بحث کرتے ہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ آپ کی دلچسپی بے جا ہے۔ میں نے صرف اسے غیر متعلق کہا تھا۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں کشمیر کے ایک ایک سیاسی لیڈر کو جانتا ہوں۔ شیخ عبداللہ سے لے کر ہر ایک آدمی کو بخوبی جانتا ہوں۔ میں ۱۹۴۵ء سے ۱۹۶۵ء تک تقریباً ہر سال کشمیر آتا رہا ہوں۔ ۱۹۴۶ء میں، میں نے شیخ محمد عبداللہ کے خلاف مقدمہ بغاوت کی ساری کاروائی کا مشاہدہ کیا ہے۔ اور اس کے لیے میں نے مرحوم آصف علی سے خاص طور پر پاس حاصل کرلیا تھا، آپ کے ان تمام سوالات کا جواب صرف یہ ہے کہ میں سوائے آپ کے سبھی کشمیری لیڈروں کو جانتا ہوں۔ اور خوب جانتا ہوں''۔ اعوان صاحب کی آنکھوں میں ایک شرارت آمیز چمک عود کر آئی تھی۔ انکے خیال میں واقعی مجھے میرے سبھی سوالات کا جواب مل گیا تھا۔

''دوسرے الفاظ میں آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کشمیری لیڈر قابلِ اعتماد نہیں''۔ میں نے نتیجہ اخذ کیا۔

''آپ اس سے جو چاہیں نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ میں تو ایک واقعاتی بات

کرر ہا ہوں''۔ مسٹر اعوان نے تردید کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔ اس کے بعد میں نے اعوان صاحب کا شکریہ ادا کر کے رخصت حاصل کر لی۔ اعوان صاحب سے اس ملاقات کا ذکر میں نے سبھی کشمیری دوستوں سے کیا اور سب لوگوں نے متفقہ طور پر یہ رائے ظاہر کی کہ اعوان جیسے فرعون مزاج افسروں نے ہی ایوب کی حکومت کے خلاف اس درجہ غم و غصے اور بیزاری کا ماحول پیدا کر لیا ہے۔ اس کے بعد جب کراچی میں، میں نے ذوالفقار علی بھٹو اور لاہور میں شورش کاشمیری سے اس ملاقات کا ذکر کیا تو دونوں لیڈروں نے مسٹر اعوان کی فرعون مزاجی اور بدتمیزی پر اظہار افسوس کیا۔ مسٹر بھٹو کے الفاظ میں ''مسٹر اعوان جیسے افسروں نے ہی صدر ایوب کی لٹیا ڈبو دی ہے''۔

پاکستان میں مارشل لاء نافذ ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد مسٹر اے بی اعوان کو قبل از وقت ریٹائر کر کے اپنے فرائض سے سبکدوش کر دیا گیا اور پاکستان سے ایک دوست نے مجھے یہ اطلاع دیتے ہوئے لکھا تھا کہ ''آج کشمیریوں کے لیے یوم نجات ہے، جنرل یحییٰ خان نے مسٹر اعوان کو کان پکڑ کر نکال باہر کیا ہے''۔

انڈین ہائی کمیشن کے پریس اتاشی مسٹر نریش دیال نے ٹیلیفون پر یہ پیغام دیا تھا کہ ہائی کمشنر سے میری ملاقات ۱۰ فروری کو گیارہ بجے صبح مقرر ہوئی ہے۔ اس لیے مسٹر اعوان سے فارغ ہو کر میں انڈین ہائی کمیشن پر گیا۔ جہاں مسٹر دیال میرا انتظار کر رہے تھے، ہائی کمشنر بی کے آچاریہ سے گھنٹہ بھر بات چیت ہوئی اور پاکستان کی سیاسی صورت حال کے متعلق مجھے ان کے خیالات جاننے کا موقع ملا۔ پاکستان میں ان کے قیام کا دوسرا ہی دن تھا اور وہ ابھی صورت حال کا جائزہ لے ہی رہے تھے۔ آچاریہ جی بزرگ آدمی ہیں بقول ان کے ''گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکے ہیں''۔ ان کے خیال میں صدر ایوب آسانی سے صدارت چھوڑنے والے نہیں۔ اور وہ دوبارہ مارشل لاء نافذ کرنے کے لیے ماحول تیار کر رہے ہیں۔ بعد کے واقعات نے آچاریہ جی کو غلط ثابت کر دیا۔

شام کو ثناء اللہ شمیم نے چائے پر بلایا تھا۔ میرے علاوہ بھی بہت سے دوست مدعو تھے۔ جن میں غلام الدین وانی، میر عبدالعزیز، مبارک احمد ڈار، صابر صاحب اور عبدالصمد وانی کا نام قابل ذکر ہے۔ شمیم صاحب بڑے زندہ دل اور حاضر جواب آدمی ہیں۔ انہوں نے چائے کے ساتھ بہت سے لطائف بھی پلائے۔ آخر میں انہوں نے اپنے دوست احباب کے نام سلام و دعا کے پیغامات دے کر رخصت کیا اور میں راولپنڈی کے شہر پر ایک آخری نظر ڈالنے کے لیے بازاروں میں گھومتا رہا۔ گھومتے ہوئے میں میر واعظ منزل گیا کہ نئے

میر واعظ سے ابھی تک میری ملاقات نہیں ہوئی تھی، بدقسمتی سے احمد صاحب گھر پر موجود نہیں تھے، میں پیغام دے آیا کہ حاضر ہوا تھا اور کل صبح جا رہا ہوں۔ مجھے گھر پہنچے ہوئے دس پندرہ منٹ ہی گذرے ہوں گے کہ میر واعظ، احمد صاحب اور احمد شمیم آئے۔ میر واعظ صاحب کو دیکھ کر مجھے قدرت حیرت ہوئی لیکن اس حیرت میں مسرت کا پہلو غالب تھا۔ میرے ذہن میں ایک باریش با دستار مولوی صاحب کا تصور تھا۔ لیکن احمد صاحب تو یونیورسٹی کے ایک خوش پوش نوجوان لگ رہے تھے۔ وہ ایک عمدہ قسم کا سوٹ اور ٹائی پہنے ہوئے تھے اور ان کی گفتگو سے ان کے میر واعظ ہونے کا قطعاً کوئی احساس نہیں ہو سکتا تھا۔ بعد میں صابر صاحب نے بتایا کہ میر واعظ احمد صاحب اچھے خاصے قسم کے ماڈرن نوجوان ہیں اور میر واعظ ہونے کے باوجود ان میں مولویت زیادہ نہیں ہے۔ احمد شمیم سے میں غائبانہ طور متعارف تھا، بعض ادبی رسائل میں، ان کی کچھ تحریریں دیکھنے کا موقع ملا تھا، وہ ان دنوں محکمۂ اطلاعات میں ملازم ہیں، انہوں نے کشمیر کے متعلق خالص مارکسی انداز میں کچھ سوالات کیئے، جس سے میں نے یہ اندازہ کیا۔ کہ وہ کشمیر کے مسئلے کو سامراجی اور اشتراکی زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ احمد شمیم نے مجھے بتایا کہ وہ کالج کے دنوں میں سخت قسم کا مسلم لیگی تھا۔ اور ۱۹۴۷ء میں صرف اس لیے کشمیر سے بھاگ آیا تھا کہ نیشنل کانفرنسی میرے خون کے پیاسے تھے۔ پاکستان میں بیس بائیس سال گذارنے کے بعد اب ایک بار اپنے وطن کشمیر کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کشمیر کی ادبی تحریک کے بارے میں بھی سوالات پوچھے اور افسوس ظاہر کیا کہ کشمیری زبان ابھی تک وہیں ہے جہاں ۱۹۴۶ء سے پہلے تھی۔ میں نے ان سے اختلاف کیا کہ شاید ۱۹۴۷ء کے بعد ان تک

کشمیری ادیبوں کی شعری اور نثری تخلیقات نہیں پہنچی ہیں۔

"اگر امین کامل اور غلام نبی خیال کی شاعری نئے شاعروں کی نمایندگی کرتی ہے تو میں یہی کہوں گا کہ کشمیری شاعری نے کوئی ترقی نہیں کی ہے"۔ احمد شمیم نے اپنا فیصلہ سنایا۔ بہت دیر تک میں انہیں یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد کشمیری زبان نے بالعموم اور شعر و ادب نے بالخصوص نمایاں ترقی کی ہے۔

کچھ دیر بعد میں نے میر واعظ احمد صاحب سے پوچھا کہ وہ کشمیر کب آرہے ہیں اور کیا میر واعظ مرحوم کی نعش کو وہاں لے جانے کا کوئی ارادہ ہے؟

"جہاں تک میرے کشمیر آنے کا تعلق ہے میں تو ہر وقت جانے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن میر واعظ مرحوم کی نعش کو وہاں سے لے جایا سکے گا یا نہیں، میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ قبلہ محمد شاہ صاحب اور یحییٰ شاہ صاحب آج کل یہیں ہیں۔ میرے خیال میں وہ کوئی قطعی فیصلہ کر کے ہی جائیں گے"۔ میر واعظ احمد صاحب نے جواب دیا۔

"میر واعظ مرحوم سے ایک لطیفہ منسوب ہے، کہ جب پاکستان کے وزیر خزانہ چودھری محمد علی نے ان سے پوچھا کہ رائے شماری کے وقت کشمیری کس کو ووٹ دیں گے، تو انہوں نے کہا کہ وہاں کے لوگ آپ کو ووٹ دیں گے اور یہاں کے ان کو۔ اس میں کہاں تک صداقت ہے؟ میں نے دریافت کیا۔

"یہ صحیح ہے۔ لیکن ان سے یہ بات چودھری محمد علی نے نہیں، محمد علی بوگرہ نے پوچھی تھی"۔ میر واعظ صاحب نے لطیفے کی تصدیق کی۔

میر واعظ اور احمد شمیم سے بہت دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ احمد شمیم بہت ہی ذہین اور خاصا پڑھا لکھا نوجوان ہے۔ اس کی ذہانت

بہت سے لوگوں نے فائدے اٹھائے ہیں۔ لیکن یہ بچارا وہیں کا وہیں رہا۔ معلوم ہوا کہ زندہ رہنے کے لیے بھی بڑی جدوجہد کرنا پڑی ہے۔ اور اس نے بہت دنوں تک Ghost Writer کا کام بھی کیا۔ اس کے اپنے بیان کے مطابق وہ بیک وقت بہت سے اخبارات نکالتا تھا، لیکن اخبار کی پیشانی پر کسی دوسرے کا نام چھپتا۔ ایک ایڈیٹر کے بارے میں اس نے شکایت کی کہ اس نے اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا اصلی مسودہ پولیس حکام کو دکھا کر اس کی نوکری کو خطرے میں ڈال دیا۔ اور وہ خدا خدا کر کے بچ گئے۔ ۱۱ر فروری کو صبح سویرے ہی کراچی اور ڈھاکہ کے لیے ویزا حاصل کر کے اسلام آباد گیا۔ ظفر کامران نے بتایا کہ صرف کراچی کے لیے ویزا منظور ہوا اور ڈھاکہ کے لیے ویزا ملنا ممکن نہ ہوسکا۔ میں ڈھاکہ جانے کے لیے بہت بے چین تھا۔ اس لیے یہ سن کر بڑی مایوسی ہوئی۔

گیارہ بجے میں راولپنڈی سے ہوائی جہاز کے ذریعے لاہور کے لیے روانہ ہوا۔ چک لالہ کے ہوائی اڈے پر میرے چچا صابر صاحب اور چچی جان مجھے الوداع کرنے کے لیے موجود تھے۔ صابر صاحب کی آنکھیں نم تھیں اور چچی جان کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے۔ جوں جوں جہاز کی روانگی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ ان دونوں کی بے چینی اور بے قراری بڑھتی جا رہی تھی اور میں یہ سوچنے لگا کہ میں نے ان لوگوں سے مل کر انہیں خوشی دی ہے یا ایک مستقل عذاب میں مبتلا کر دیا ہے؟ صابر صاحب کے الفاظ میں، میں نے ان کی مایوس اور خاموش دنیا میں ایک ہل چل بپا کر دی تھی۔ ابھی تک وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے، کہ ہم ایک دوسرے کے لیے مر چکے ہیں۔ لیکن بیس سال کے بعد پاکستان میں میری اچانک آمد نے ان کی سوئی ہوئی خوشیوں،

امیدوں اور آرزوؤں کو جگا دیا تھا۔ وطن کی یاد ایک بار پھر تازہ ہوگئی اور اپنے پردیسی ہونے کا احساس شدید تر ہوگیا۔

جہاز کی روانگی میں صرف پندرہ منٹ باقی تھے، چچی جان نے برقعے سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "کیا یہ ممکن ہے کہ کبھی میں بھی کشمیر میں آ کر اپنے بھائی بہنوں سے مل سکوں، اگر تم سے کچھ ہو سکے تو ضرور میرے لیے کوشش کرنا"۔

ابھی تک میرے جذبات بڑی مشکل سے میرے قابو میں تھے۔ لیکن چچی جان کی یہ خواہش ان کی یہ التجا سن کر میری آنکھیں بھی نم ہوگئیں۔ میں ان سے کہنا چاہتا تھا کہ جن بھائی بہنوں سے ملنے کے لیے آپ یوں بے قرار ہیں وہ تو کئی سال گذرے، موت کی وادیوں میں پہنچ چکے ہیں۔ بائیس سال سے کتنی بہنیں اپنے بھائیوں کے انتظار میں اپنی آنکھوں کی بینائی کھو بیٹھیں اور ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا، کہ جن کو دیکھنے کے لیے ان کی آنکھیں ترس گئی ہیں ان کا اب اس دنیا میں وجود ہی نہیں۔ میں نے سوچا کہ چچی جان سے کہہ دوں کہ ان کی بہن اور بھائی دونوں ہی مر چکے ہیں۔ لیکن اس خیال سے کہ ان پر کیا گذرے گی، میں خاموش رہا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ اپنا پاسپورٹ بنوا لیں۔ میں ویزا کا انتظام کرلوں گا۔ پھر صابر صاحب نے گلوگیر آواز میں کہا: "بیٹا! اٹھو جہاز کی روانگی کا وقت ہوگیا ہے"۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے گلے لگا کر چوما، اور میں ایک شدید جذباتی ہیجان میں مبتلا جہاز کی جانب قدم بڑھانے لگا!

راولپنڈی سے لاہور تک کا سفر ایک گھنٹے میں طے ہوگیا۔ پی۔آئی۔اے کے جہاز میں یہ میرا پہلا سفر تھا۔ اور میرے ذہن پر اس تجربے کا بہت خوشگوار

اثر ہوا۔ پی۔ آئی۔ اے کی ہوسٹس ہمارے ہاں کی ہوسٹس کے مقابلے میں زیادہ خوش اخلاق، چاق وچوبند اور پھرتیلی ہے۔ اس کا لباس بھی ہمارے ہاں کے مقابلے میں زیادہ خوش نما اور دیدہ زیب ہوتا ہے۔ جہاز میں ہمیں لنچ دیا گیا۔ وہ بھی ہمارے ہاں کے مقابلے میں بہت بہتر تھا۔ لاہور سے کراچی اور کراچی سے واپس لاہور کے سفر میں میرے ان تاثرات کو تقویت مل گئی۔ ہمارا جہاز لاہور کے ہوائی اڈے پر اترنے سے صرف چند منٹ پہلے صدر ایوب ڈھاکہ سے لاہور پہنچ گئے تھے۔ اس لیے ہوائی اڈے پر سیکورٹی پولیس کے سینکڑوں آدمی تعینات تھے۔ میں نے صدر ایوب کی صرف ایک جھلک دیکھی۔ وہ ایک سیاہ کار میں پہلی نشست پر بیٹھے ائیر پورٹ سے باہر جارہے تھے۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا اور وہ کچھ پڑھ رہے تھے۔ اتنے میں میری آنٹی محمودہ عبداللہ نے مجھے آواز دی، میں نے انہیں اٹھارہ برس قبل دیکھا تھا، جب وہ خوبصورتی اور تندرستی کا ایک قابل تعریف نمونہ تھیں۔ اگر مجھے پہلے سے یہ معلوم نہ ہوتا کہ وہ ہوائی اڈے پر مجھے لینے کے لیے آئیں گی۔ تو میں ہرگز ہرگز انہیں پہچان نہ پاتا۔ وہ بے حد دبلی اور بیمار نظر آرہی تھیں ان کے چہرے پر نقاہت اور بڑھاپے کے آثار نظر آرہے تھے۔ اور انہیں دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ اٹھارہ برس میں یہ انقلاب!

آنٹی نے مجھے بتایا کہ شہر سے ہوائی اڈے تک پہنچنے میں انہیں دو گھنٹے لگے اور اب یہاں سے واپس جانے میں بھی بڑی مشکل ہوگی۔ معلوم ہوا کہ ڈھاکہ سے صدر ایوب کے لاہور آنے کی خبر صبح ہی شہر میں پھیل گئی تھی اور سارا شہر صدر کے خلاف مظاہرے کرنے کے لیے ہوائی اڈے کی طرف آرہا ہے۔ سائیکلوں، موٹر سائیکلوں اور ٹیکسیوں میں سوار ہزاروں طلباء کو گورنر ہاؤس سے

پچھ دور کے فاصلے پر پولیس نے روک لیا تھا اور شہر میں زبردست تناؤ تھا۔ اکثر دکانیں بند تھیں۔ اگر پولیس نے غیر معمولی حفاظتی اقدامات نہ کیے ہوتے، تو صدر کے لیے گورنر ہاؤس تک پہنچنا یقیناً ناممکن تھا۔ لیکن پولیس نے ہوائی اڈے کی طرف آنے والے سبھی راستے بند کر دئے تھے اور قدم قدم پر سخت پہرہ بٹھا دیا تھا۔ صدر ایوب گورنر ہاؤس میں داخل ہو چکے تھے۔ لیکن شہر میں دوسرا ہی نظارہ تھا۔ طالب علموں نے ٹریفک کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور چوراہوں پر پولیس کے سپاہیوں کی بجائے طالب علم ٹریفک کنٹرول کرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ راستے میں کئی بار ہماری ٹیکسی کو روک کر ہم سے ایوب کتا مردہ باد کے نعرے لگوائے گئے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ لاہور شہر پر طالب علموں کی حکومت ہے۔ صدر ایوب کے سرکاری ایڈمنسٹریشن کا کہیں نام ونشان نظر نہیں آرہا تھا۔ ساری پولیس گورنر ہاؤس کا محاصرہ کئے ہوئے تھی اور شہر طالب علموں کے سپرد کیا گیا تھا۔ اُسی روز میرے چچا مشتاق احمد فاروق مجھے الوداع کہنے مظفر آباد سے لاہور پہنچ گئے۔ شام کو میں اور فاروق صاحب دیر تک مال روڈ پر ٹہلتے رہے۔ شہر میں یوں تو معمول کا کاروبار جاری تھا۔ لیکن صدر ایوب کی موجودگی کی وجہ سے ایک تناؤ کی سی کیفیت موجود تھی۔ دن بھر طالب علموں کے چھوٹے چھوٹے جلوس صدر کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے مال روڈ سے گذرتے اور اب شام کو نسبتاً سکوں کا احساس تھا۔ مال روڈ سے باغ جناح (لارنس گارڈن) کی طرف ''واپڈا'' کی عظیم الشان بلڈنگ ہے اور اس کے سامنے ایک چوراہے کو ''چیرنگ کراس'' کہتے ہیں۔ انارکلی سے آتے ہوئے مال روڈ کے آخری سرے پر بائیں جانب کو مڑیئے تو کچھ فاصلے پر مغربی پاکستان اسمبلی کی عالی شان عمارت واقع ہے۔ ان دنوں مغربی پاکستان

اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا اور اخبارات میں اس کی ''دلچسپ'' کاروائی پڑھ کر میں بڑا محظوظ ہوا کرتا۔ کشمیر اسمبلی کی طرح مغربی پاکستان اسمبلی میں بھی مخالف ممبروں کی تعداد اتنی مختصر تھی کہ اگر اسمبلی کا سپیکر کوئی التوا کی تحریک پیش کرنے کی اجازت بھی دیتا تو اس کی حمایت میں ممبروں کی مقررہ تعداد کھڑی نہیں ہوتی اور اس طرح کبھی کسی تحریک التواء یا دوسرے کسی تحریک پر بحث ہونے کا امکان نہیں تھا۔ اسمبلی کی عمارت جلسوں اور جلوسوں کا مرکز تھی۔ ہر جلسہ یہاں شروع ہو کر پھر جلوس کی صورت اختیار کرتا اور ہر جلوس اس نقطے پر ختم ہو کر جلسے میں تبدیل ہو جاتا۔

شہر کے مختلف حصوں سے آنے والے جلوس، تب تک مکمل نہیں سمجھے جاتے، جب تک کہ وہ مال روڈ سے گذر کر اسمبلی ہاؤس کے سامنے نہ پہنچتے۔ اسی لیے ایجی ٹیشن کے دوران پولیس اور مظاہرین کے درمیان سب سے زیادہ تصادم اسی شاہرہ پر دیکھنے میں آئے جسے اب شاہراہ قائداعظم کا نام دیا گیا ہے۔ میں چچا فاروق کے ساتھ ٹہلتے ٹہلتے باغ جناح تک گیا۔ اس باغ میں شام کو شہر والوں کا ہجوم ہوتا ہے مگر آج پورے باغ میں کل ملا کر دس بیس آدمی بھی نہ ہوں گے۔ چچا جان مجھے تفصیل کے ساتھ اپنی آپ بیتی سناتے رہے اور میں اطمینان کے ساتھ سنتا گیا۔

18

۱۱ر فروری کو پاکستان بھر میں جمہوری مجلس عمل کے زیر اہتمام ''یوم احتجاج'' منانے کا اعلان کیا گیا تھا اور چونکہ مجلس کا صدر دفتر لاہور میں تھا، اس لیے یہاں بہت بڑا مظاہرہ ہونے والا تھا۔ بظاہر شہر کا کاروبار معمول کے مطابق چل رہا تھا، لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ لاوا اندر سے پک رہا ہے اور ۱۴ر فروری کو بہت بڑا دھماکہ ہوگا۔ پروگرام کے مطابق مجھے اُس دن کراچی کے لیے روانہ ہونا تھا، لیکن لاہور کے حالات کا جائزہ لے کر میں نے اپنی روانگی ملتوی کر کے پندرہ کے لیے اپنی سیٹ بک کر دی۔ میری پھوپھی کا مکان، جہاں میں رہ رہا تھا، لاہور ہائی کورٹ کے عقب میں فرید کوٹ ہاؤس کے بالمقابل ہے۔ یہ ساری بستی وکیلوں کے دفتروں اور ان کے رہائشی مکانات پر مشتمل ہے اور وکیلوں کی یہ بے تحاشا آبادی دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ قیام پاکستان کے بعد سے اس صنعت کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ہے۔ چچا مشتاق نے مجھے بتایا کہ لاہور ہائی کورٹ کا بار پاکستان بھر میں سب سے زیادہ بااثر اور باوقار ادارہ سمجھا جاتا ہے اور پاکستان کا حالیہ سیاسی انقلاب بہت حد تک لاہور کے وکیلوں نے برپا کر دیا ہے۔ معلوم ہوا کہ ہماری رہائش گاہ کے ساتھ ہی آزاد کشمیر کے سابق صدر سردار محمد ابراہیم کا دفتر ہے۔ اس لیے میں نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ مشتاق صاحب نے میری رہنمائی کی اور ۱۳ر فروری کی صبح کو میں ان سے ملنے کے لیے گیا۔ میرے ذہن میں سردار محمد ابراہیم خان کی جو تصویر تھی، خان صاحب اس تصویر سے بہت مختلف نظر آئے،

دبلے پتلے نازک سے آدمی ہیں، گوری رنگت پر کالا لباس خوب سج رہا تھا، لیکن ایسا معلوم ہورہا تھا کہ بہت دنوں کی بیماری کے بعد دفتر آئے ہوں۔ چہرے سے نقاہت ٹپک رہی تھی۔ مشتاق صاحب نے میرا تعارف کرایا تو بہت تپاک سے ملے اور چند ہی لمحوں کے اندر کچھ ایسے بے تکلف ہو گئے کہ جیسے بہت پرانی ملاقات ہو۔ کشمیر کے متعلق کچھ رسمی سوالات پوچھ کر پھر آزاد کشمیر اور پاکستان کی سیاست پر تبصرہ فرمایا۔ ان کے خیال میں کشمیر کے تئیں پاکستانی عوام کا رویہ بے حد مخلصانہ اور دیانت دارانہ ہے اور پاکستانی عوام کشمیر کی خاطر کوئی بھی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔ وہ صدق دلی سے اپنے کشمیری بھائیوں کی آزادی اور بہتری کے خواہشمند ہیں، لیکن پاکستانی حکمرانوں کا رویہ ابتداء سے کشمیر اور اہل کشمیر کے ساتھ حاکم اور محکوم کا سا رہا ہے۔ مرحوم لیاقت علی خان سے لے کر ایوب خان تک ہر پاکستانی حاکم نے ہمارے ساتھ ہتک آمیز سلوک روا رکھا ہے۔ کشمیر کے سوال پر کشمیری لیڈروں کو کبھی اعتماد میں نہیں لیا گیا اور اس وقت بھی جب کہ میں پاکستانی وفد کے ہمراہ لیک سیکنس میں کشمیر کی ''نمائندگی'' کر رہا تھا۔ مجھ سے کوئی مشورہ نہیں کیا جاتا تھا اور یہی بات ان تمام صدروں کے بارے میں صحیح ہے: جو میرے بعد آزاد کشمیر کے صدر بنائے گئے۔ سردار محمد ابراہیم نے شکایت کی کہ پاکستان کے حاکموں نے پچھلے پندرہ بیس سال کے دوران ایک بار بھی آزاد کشمیر میں نمائندہ حکومت قائم کرنے کی کوشش نہیں کی، لیکن ان تمام شکایات کے باوجود میں پاکستان کی خاطر اپنا خون بہانے کے لیے تیار ہوں اور یہ چاہوں گا کہ کشمیر پاکسنان کا حصہ بنے، کیونکہ مجھے پاکستانی عوام کی محبت، ان کے خلوص اور ان کے ایثار پر بے پناہ اعتماد ہے اور میں جانتا ہوں کہ پاکستان کے لوگ کشمیر کی خاطر اپنی زندگی

قربان کرنے کے لیے بھی تیار ہیں۔ اس کے بعد سردار صاحب نے مجھے اپنی خودنوشت سوانح ''متاعِ زندگی'' کی ایک کاپی دی اور کہا کہ اس کے مطالعے سے آپ کو صحیح صورت حال کا اندازہ ہوگا۔ میری دو پھوپھی زاد بہنیں، سیالکوٹ اور ساہی وال کے کالجوں میں لیکچرر ہیں اور میں ان سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ لیکن میرے پاس نہ سیالکوٹ کا ویزا تھا اور سیاہی وال کا۔ مشکل یہ تھی کہ ان کا لاہور آنا بھی ممکن نہ تھا۔ ان دنوں پاکستان بھر میں تعلیمی ادارے بند تھے، لیکن استادوں کو یہ ہدایت تھی کہ وہ اجازت کے بغیر رخصت پر نہیں جاسکتے اور اجازت حاصل کرنے میں کئی دن لگ جاتے۔ میں نے حبیب اللہ ککرو صاحب سے ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ آغا افضل مدد کر سکتے ہیں۔

آغا افضل، آغا مظفر (فائنانشل کمشنر، کشمیر) کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ۱۹۴۵ء سے پاکستان میں رہ رہے ہیں، اور اب ترقی کرتے کرتے مغربی پاکستان کے ایڈیشنل چیف سیکریٹری ہوگئے ہیں۔ میں نے فوراً آغا صاحب کے دفتر فون کر دیا اور کہا کہ میں کشمیر سے آیا ہوں اور آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ آغا صاحب نے بلایا تو میں نے انہیں آغا مظفر کا سلام دیا اور کہا کہ اُنھوں نے آپ سے ملنے کی سخت تاکید کی تھی (یہ پاکستان کی سرزمین پر میرا پہلا جھوٹ تھا) پھر کچھ دیر بعد میں نے اپنی مشکل بیان کردی، اور آغا صاحب نے فوراً ہی سیالکوٹ اور ساہی وال ٹیلیفون کر کے دونوں بہنوں کی چھٹی کا انتظام کروادیا اور شام ہوتے ہوئے دونوں بہنیں لاہور پہنچ گئیں۔

۱۴ر فروری کو سارا شہر بند تھا۔ سڑکوں پر ٹیکسی، بس یا تانگے کا نام ونشان نظر نہ آتا تھا۔ سڑک کے چوراہوں پر ٹریفک کے سپاہی بھی غائب تھے۔ پوری

فضا میں ایک تناؤ کی سی کیفیت تھی۔ دس بجتے بجتے نعروں کی گونج سنائی دینے لگی۔ مجلسِ عمل کی طرف سے بعد نماز ایک بھاری جلوس نکالنے کا پروگرام تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی مختلف تنظیموں اور اداروں کی طرف سے بڑے بڑے جلوس نکلنا شروع ہو گئے تھے اور مال روڈ پر سے ہر آدھے گھنٹے کے بعد ایک جلوس گذرتا، پولیس کی طرف سے کوئی خاص مزاحمت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن واپڈا ہوس کے قریب چیئرنگ کراس پر پولیس بھاری تعداد میں تعینات تھی، تاکہ مظاہرین کو گورنر ہاؤس کی طرف بڑھنے سے روکے۔ گیارہ بجے کے قریب لاہور کے وکیلوں کا جلوس مال روڈ سے گذر کر چیرنگ کراس تک آ گیا۔ مظاہرین کے ہاتھ میں سیاہ جھنڈے تھے جن پر ''جمہوریت بحال کرو'' کے نعرے لکھے ہوئے تھے۔ اس جلوس کے ساتھ بہت سے اور لوگ بھی شامل ہو گئے تھے اور پولیس نے اسے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی کچھ دیر تک مظاہرین اور پولیس کے درمیان بحث و تکرار ہوئی اور بالآخر صرف وکیلوں کو آگے بڑھنے کی اجازت دی گئی۔ ایک بجے کے قریب لاہور کے ڈاکٹروں، لیڈی ڈاکٹروں، نرسوں اور شفاخانوں کے دیگر عملے پر مشتمل ایک بھاری جلوس نے مال روڈ کا گشت کرنا شروع کر دیا۔ پھر طالب علموں کے جلوس نظر آنے لگے اور رفتہ رفتہ کھچاؤ بڑھنے لگا۔ اگرچہ پولیس کے سپاہی کسی قسم کی مداخلت نہ کرتے تھے، لیکن طالب علموں کو جہاں بھی پولیس نظر آتی، وہ اس پر پتھراؤ کرتے، پولیس نے 'جوابی کاروائی' کے طور پر اشک آور گیس استعمال کرنا شروع کی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے مال روڈ کا سارا علاقہ دھوئیں سے بھر گیا۔ اس سے لوگ اور زیادہ مشتعل ہو گئے اور اب پولیس اور مظاہرین کے درمیان باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ پولیس پر چاروں طرف سے پتھروں کی بارش

ہونے لگی اور پولیس نے بے تحاشا لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ ایک بار میں لاہور ہائی کورٹ کے قریب کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا کہ بڑے زور کی لاٹھی چلی، اشک آور گیس سے کچھ سُجھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ہائی کورٹ کے صحن میں گھس گیا۔ چند لمحوں بعد پولیس یہاں بھی گھس آئی اور اندھا دھند لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ میں کیسے بچ گیا، خدا ہی بہتر ہی جانتا ہے۔ دوسرے دن ہائی کورٹ کے احاطے میں پولیس کے داخل ہونے پر بار ایسوسی ایشن نے سخت احتجاج کیا اور حکومت نے اس واقعہ کی تحقیقات کا وعدہ کیا۔ جمعہ کی نماز کے بعد موچی دروازہ سے ایک بہت بڑا جلوس مال روڈ کی طرف روانہ ہوا۔ اس کی قیادت مجلس عمل کے نصر اللہ خان، شورش کاشمیری، مولانا عبید اللہ اور دوسرے رہنما کر رہے تھے۔ لاہور کے مرکزی ڈاک خانے تک پہنچتے پہنچتے یہ جلوس انسانوں کا ایک وسیع سمندر نظر آ رہا تھا۔ کم از کم دو لاکھ سے زائد لوگ فلک شگاف نعرے بلند کرتے ہوئے مال روڈ کی طرف آ رہے تھے۔ جلوس کے آگے آگے خاکساروں کا ایک دستہ تھا اور ہائی کورٹ کے عین سامنے ان لوگوں نے نماز عصر ادا کرنا شروع کر دی۔ جلوس کے بالکل درمیانی حصے میں نوابزادہ نصر اللہ خان، شورش کاشمیری اور مولانا عبید اللہ آگے بڑھتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

میں نے سوچا کہ اتنے بڑے جلوس پر نہ لاٹھی چارج ہو سکتا ہے اور نہ گولی چلائی جا سکتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ مال روڈ پر متعین پولیس جلوس کی آمد سے پہلے ہی اندر گلیوں میں گھس گئی تھی۔ اس لیے جوں توں کر کے میں بھی رہنمایان کرام کے قریب پہنچ گیا۔ اور اب میں باقاعدہ طور اسی تاریخی جلوس کا ایک حصہ تھا۔ طالب علم بڑی شدت کے ساتھ ”سودا بازی نہیں چلے گی“ کے نعرے

بلند کر رہے تھے۔ ان کا اشارہ نوابزادہ نصر اللہ خان کی طرف تھا کہ جو مجلس عمل کی طرف سے صدر ایوب کے ساتھ بات چیت کرنے کے لیے منتخب ہوئے تھے۔ ہائی کورٹ سے کچھ فاصلے پر سڑک کے اندر کی طرف کچھ مظاہرین کو پولیس کے سپاہی اور گاڑیاں نظر آئیں بس پھر کیا تھا۔ جلوس میں شامل نوجوانوں کی ایک بھاری تعداد نے ان پر بے تحاشا پتھراؤ کرنا شروع کر دیا اور کچھ گاڑیوں میں آگ لگانے کی کوشش کی۔ ایک سپاہی بھاگنے کی کوشش میں پکڑا گیا اور قریب تھا کہ لوگ اسے جان سے مار ڈالتے کہ پولیس نے گولی چلا دی۔ بس پھر کیا اڑھائی لاکھ لوگوں کے جلوس میں گولی چلے تو کیا ہو سکتا ہے۔ وہ بھگدڑ مچ گئی کہ خدا کی پناہ عین میرے سامنے ایک نوجوان گولی لگنے سے گر پڑا۔ اور شورش کاشمیری اشک آور گیس کا ڈبہ لگ جانے سے بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں بے تحاشا بھاگ رہا تھا اور بھاگتے بھاگتے جب گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ میری بائیں ٹانگ سے خون کے فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ مجھے اب بھی حیرت ہے کہ میں اُس دن بچ کیسے گیا۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ اس ہنگامے میں تین نوجوان مارے گئے۔

19

۱۵ر فروری کو میں لاہور سے کراچی پہنچ گیا۔ کراچی کے ہوائی اڈے پر محاذ رائے شماری کے جنرل سیکریٹری امان اللہ خان اور میر قیوم صاحب میرا استقبال کرنے کے لیے موجود تھے اور باوجود اس کے کہ ان دونوں سے یہ میری پہلی ملاقات تھی، امان اللہ نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ اس نے کہا کہ ہم ایس پی کالج میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ یہ غالباً ۱۹۵۲ء کی بات ہے اور مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میرے ذہن میں امان اللہ کی دھندلی سی یاد بھی موجود نہ تھی۔ زندگی کے سفر میں کتنے ہی ساتھی مل کر بچھڑ جاتے ہیں اور کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی یاد زندگی بھر ساتھ رہتی ہے۔ امان اللہ کا نام اور اسکی شکل وصورت ہم سفروں کے اس ہجوم میں کہیں کھو گئی تھی۔ میر قیوم جموں کے رہنے والے ہیں۔ ملک کی تقسیم کے بعد وہ وطن چھوڑ کر پاکستان جانے کے لیے مجبور ہو گئے، جہاں انہوں نے اپنے بڑے بھائی میر منان کے ساتھ مل کر ایڈورٹائزنگ کا کام شروع کر دیا۔

ہوائی اڈے سے شہر کی طرف جاتے ہوئے امان اللہ نے مجھے بتایا کہ کل شہر میں زبردست فسادات ہوئے ہیں اور شہر کے بعض حصوں میں زبردست تناؤ پایا جاتا ہے۔ ناظم آباد اور گولی مار کے علاقوں میں صدر ایوب کے حامی پٹھانوں اور عام لوگوں میں زبردست تصادم ہوا ہے اور اندیشہ ہے کہ صورتِ حال کچھ دنوں کے لیے مخدوش رہے۔ جوں جوں شہر قریب آتا گیا، مجھے کراچی کی وسعتوں کا کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا، یہ پاکستان کا سب سے بڑا اور تجارتی

اعتبار سے سب سے اہم شہر ہے۔ لاہور اور راولپنڈی کے مقابلے میں اس کی حیثیت وہی ہے، جو لکھنو اور آگرہ کی کلکتہ اور بمبئی کے مقابلے میں ہو سکتی ہے۔ ملک کی تقسیم کے بعد لاہور اور راولپنڈی کے شہر بھی دور دور تک پھیل گئے ہیں۔ لیکن کراچی کے پھیلاؤ میں طوفان کی سی کیفیت اور سمندر کی سی وسعت ہے اور گزشتہ بیس بائیس برسوں میں پاکستان کی صنعتی ترقی کا اندازہ کرنا ہو تو کراچی کو دیکھے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ مغربی پاکستان کی تمام بڑی صنعتیں یہیں قائم ہیں اور پاکستان کا دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے اسے غیر معمولی سیاسی اہمیت بھی حاصل تھی۔ صدر ایوب نے اسلام آباد میں نیا دارالخلافہ تعمیر کر کے کراچی کے لوگوں کو بہت ناراض کر دیا تھا اور اسی لیے صدر کے لیے ایجی ٹیشن میں وہ پیش پیش تھے۔ کراچی میں بہت سے کشمیری آباد ہیں اور یہ کشمیری لاہور، راولپنڈی یا مظفر آباد میں مقیم کشمیریوں کے مقابلے میں زیادہ خوشحال اور فارغ البال نظر آتے ہیں۔ ان میں سے اکثر لوگ تجارت کرتے ہیں اور گزشتہ بیس بائیس برسوں میں انہوں نے اپنی تجارت کو بڑی مستحکم بنیادوں پر قائم کیا ہے، مسٹر پراچہ، مسٹر غلام محمد لون، اور دوسرے کئی کشمیریوں کا شمار کراچی کے متمول ترین لوگوں میں ہوتا ہے۔ پاکستان کے دوسرے شہروں میں مقیم کشمیریوں اور کراچی میں آباد کشمیریوں کے درمیان اس فرق کی وضاحت کرتے ہوئے ایک کشمیری دوست نے مجھے بتایا کہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ آزاد کشمیر، لاہور یا پنڈی میں رہنے والے کشمیری بھائی زیادہ ر سیاست کے چکر میں پڑے رہے۔ پاکستانی حکمران ان کو مطمئن کرنے کے لیے انہیں وظیفے دیتے رہے اور اس طرح ان لوگوں کو وظیفوں اور سرکاری لائسنسوں کی لت پڑ گئی۔ اس کے مقابلے میں کراچی میں زندہ رہنے کے لیے

بڑی جدوجہد کرنا پڑتی ہے اور یہاں وہی لوگ آ کر آباد ہو گئے، جو سیاسی وظیفوں کی بجائے اپنی محنت اور مشقت کے بل بوتے پر زندہ رہنا چاہتے تھے، اکثر کشمیری مظفر آباد، لاہور، راولپنڈی اور سیالکوٹ میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ اس لیے پاکستان کی حکومت ان ہی کی خاطر تواضع اور دیکھ بھال میں مصروف رہی۔ سیاست سے ان کی گہری دلچسپی اور پاکستانی حکومت کی خاطر تواضع نے انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہونے دیا اور اسکے مقابلے میں کراچی والوں کو زندہ رہنے کے لیے سخت جدوجہد کرنا پڑی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تجارت اور کاروبار میں کھو گئے۔ میرے دوست کی یہ وضاحت واقعاتی طور پر صحیح ہے یا نہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کراچی میں مقیم کشمیری نسبتاً زیادہ آسودہ اور خوش حال ہے۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کشمیریوں کو کشمیر سے کوئی دلچسپی یا لگاؤ نہیں، یا یہ کہ ان کو پاکستان اور کشمیر کی سیاست سے کوئی واسطہ نہیں۔ حق یہ ہے کہ کراچی میں رہنے والے کشمیری سیاسی طور پر سب سے زیادہ متحرک اور فعال ہیں اور ان کی آسودگی نے انہیں اپنے وطن کے مستقبل سے زیادہ گہری دلچسپی لینے کا موقع دیا ہے۔ محاذ رائے شماری کے سب سے سرگرم اراکین امان اللہ، غلام محمد لون، میر قیوم، میر منان، علی محمد بانکا اور بہت سے دوسرے لوگ کراچی سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ کشمیر میں گرفتار ہونے والے مقبول اور اس کے دوسرے ساتھی اسی گروپ سے تعلق رکھتے تھے اور ان لوگوں کا سیاسی موقف یہ ہے کہ رائے شماری کی صورت میں ریاست کے لوگوں کو ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ آزاد اور خود مختار کشمیر کا انتخاب کرنے کا حق بھی حاصل ہونا چاہیے اور اسی لیے یہ گروپ پاکستانی حکام کی نظروں میں پسندیدہ نہیں ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں، کہ جو کشمیر کو ہر قسم کے تسلط سے آزاد کرانے

کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔ان کے سیاسی نظریات اور مسائل کو حل کرنے کے طریقے سے مجھے اختلاف ہے، لیکن میں ان کے خلوص اور ان کی حب الوطنی سے بے پناہ متاثر ہوا۔

شام کو میں اپنے میزبانوں کے ہمراہ نفسٹن بیچ دیکھنے کے لیے چلا گیا۔ میں نے اس سے پہلے بمبئی، مدراس، پانڈیچری اور کنیا کماری کے Beaches دیکھے ہیں، لیکن انفسٹن بیچ کا حسن اپنی انفرادیت اور رکھ دکھاؤ کے اعتبار سے لاجواب ہے۔اس بیچ کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے کے لیے پاکستان گورنمنٹ نے ایک ماسٹر پلان تیار کیا ہے۔ جو اس وقت زیر تکمیل ہے۔سمندر کی لامحدود وسعتوں میں ایک خاموش، مگر مرعوب کرنے والی قوت کا احساس ہوتا ہے اور جب انسان پہلی بار سمندر دیکھتا ہے تو اُسے زمین کی تنگ دامنی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔انفسٹن بیچ کو دیکھ کر مجھ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوگئی کہ جیسے میں نے پہلی بار سمندر دیکھا ہو، کچھ دیر تک سمندر میں اٹھنے والی لہروں کے اتار چڑھاؤ کا نظارہ دیکھنے کے بعد ہم لوگ بندر روڈ کی جانب چل دیئے۔ بندر روڈ کراچی کی سب سے معروف ترین شاہراہ ہے اور یہاں ایک سیکنڈ کے لیے بھی موٹروں کی آمد ورفت میں ٹھہراؤ پیدا نہیں ہوتا۔کراچی میں، میں نے جتنی موٹریں دیکھیں کلکتہ اور بمبئی میں بھی نہیں دیکھی ہیں اور ان کاروں میں ۹۰٪ سے بھی زائد کاریں غیر ممالک میں بنی ہوئی ہیں۔کراچی کی عالیشان اور فلک بوس عمارتوں نے اس شہر کو ایک عجیب شان وشوکت بخشی ہے اور یہاں قدم قدم پر نئی عمارات تعمیر ہوتی نظر آرہی ہیں۔ حبیب بینک کی نئی عمارات ۲۷ منزلہ ہوگی اور یہ ان دنوں تیار ہورہی تھی۔

کراچی میں زیادہ تر یوپی کے مہاجر آباد ہیں۔ ناظم آباد اور لیاقت آباد کی

نئی بستیاں ان ہی مہاجروں نے بسائی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران یو پی سے جتنی ٹرینیں پاکستان پہنچیں، مرحوم لیاقت علی خان نے ان کا رُخ کراچی کی طرف کر دیا اور اسی لیے کراچی کی اکثر مہاجر آبادی، یو، پی والوں پر مشتمل ہے۔ مقامی لوگ آج بھی یو پی والوں کو ہندوستانی کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ ہندوستانی بڑے تیز اور جھگڑالو ہیں اور کراچی کی بزمِ سیاست کی رنگارنگی ان ہی کے دم قدم سے قائم ہے۔ محترمہ فاطمہ جناح اور صدر ایوب کے درمیان صدارتی انتخابات میں اہل کراچی نے مِس جناح ہی کا ساتھ دیا تھا اور اس طرح ایوب کے خلاف بغاوت اور بیزاری کا علم بلند کرنے میں ان لوگوں نے اس وقت پہل کی تھی کہ جب ذوالفقار علی بھٹو اور دوسرے لوگ صدر کی شان میں قصیدے پڑھ رہے تھے۔

شام کو میر قیوم کی قیام گاہ (جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا) پر بہت سے کشمیری دوست احباب جمع ہو گئے۔ اور رات گئے تک کشمیر اور اہل کشمیر کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ غلام محمد صاحب لون کو یہ شکایت تھی کہ شیخ صاحب اور دیگر کشمیری رہنما جب بھی کشمیر کی بات کرتے ہیں، تو ان کے ذہن میں ہندوستانی کشمیر کا تصور ہوتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے آزاد کشمیر کو اپنے ذہن سے خارج کر دیا ہے۔ میر منان کو یہ شکوہ تھا، کہ جب بھی کشمیر کی بات ہوتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جموں کے صوبے کا اس مسئلے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اُنہوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ ہوسکتا ہے کہ کشمیری لیڈر کشمیر کے سوال پر کسی قسم کی مصالحت یا سمجھوتہ کرتے وقت جموں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیں۔ امان اللہ کو یہ تشویش تھی کہ کشمیر میں رائے شماری کے وقت ریاستی لوگوں کو صرف ہندوستان یا پاکستان کے درمیان انتخاب کا حق حاصل ہوگا۔ حالانکہ انہیں خود

مختار کشمیر کے متعلق بھی اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع مل جانا چاہیے۔

دوسرے دن میں امان اللہ کو لے کر قائداعظم کے مزار پر گیا۔ قائداعظم کا مزار ابھی مکمل نہیں ہوا ہے۔ اور اس کی تکمیل کا کام بڑے زوروں سے جاری ہے۔ مکمل ہونے پر یہ فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہوگا۔ اس پر ابھی تک ۴۲ لاکھ روپے صرف ہو چکے ہیں۔ اور ایک اندازے کے مطابق پچاس لاکھ روپے کے قریب اور خرچہ آئے گا۔ اس کے اردگرد کی ساری زمین کو خاص طور پر Develop کیا جا رہا ہے۔ زیر تعمیر مزار کے بالکل ساتھ مرحوم لیاقت علی، سردار عبدالرب نشتر اور محترمہ فاطمہ جناح کی قبریں بھی موجود ہیں۔ قائداعظم کے بعد پاکستان کے لوگ صرف ان ہی تین شخصیتوں کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اسی لیے صرف ان ہی تین ہستیوں کو مزار قائد کی آغوش میں دفن کیا گیا ہے۔

۱۷ فروری کو ذوالفقار علی بھٹو نظر بندی سے رہائی کے بعد پہلی مرتبہ کراچی آرہے تھے اور کراچی میں ان کے شاندار استقبال کا پروگرام تھا۔ مسٹر بھٹو دن کے بارہ بجے جولان ریلوے سٹیشن پہونچے تو وہاں ہزاروں لوگوں نے ان کا بڑی گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا اور ساری فضا ذوالفقار علی بھٹو زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگی۔ بھٹو صاحب نے ریلوے سٹیشن کے باہر ایک کھلے ٹرک پر کھڑے ہو کر ایک مختصر سی تقریر کی۔ مجمع بہت بڑا تھا اور وہاں لاؤڈ سپیکر کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس لیے تقریر تو بہت کم لوگ سن سکے، لیکن بھٹو کی اداکاری سے سب لوگ محظوظ ہوئے۔ وہ بیک وقت اپنے ہاتھ، پیر اور ٹانگیں ہلا ہلا کر یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا، کہ اس کے ہاتھوں غلامی کی زنجیر ٹوٹ گئی ہے اور اب صدر ایوب کی دم توڑتی ہوئی لاش کو صرف ایک دھکا دینے کی ضرورت ہے۔ بھٹو کی ایک ایک ادا پر ہزاروں کا مجمع قربان ہو رہا تھا اور مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ پاکستان کے نوجوانوں میں کتنا مقبول ہے۔ یہاں سے جلوس قائداعظم کے مزار کی جانب روانہ ہوا اور چار میل کا فاصلہ سوا تین گھنٹے میں طے ہوا، جوں جوں جلوس آگے بڑھتا گیا۔ اس کی وسعتوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سارا شہر بھٹو کو خوش آمدید کہنے کے لیے سڑکوں پر آگیا تھا۔ مکانوں کی چھتوں اور کھڑکیوں پر ہزاروں لوگ مسٹر بھٹو کو ایک نظر سے دیکھنے کے لیے صبح سے منتظر تھے۔ بھٹو صاحب غلام رسول تالپور اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ ایک کھلے ٹرک میں سوار تھے۔ ان کے

آگے آگے نوجوانوں کے کئی گروہ بانگڑہ کی طرز کا ناچ کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ ایک مشہور سندھی لوک گیت میں تعریف کر کے ''بھٹو آ گیا میدان میں، ہو جمالو'' کا گیت نوجوان بڑے جوش و خروش کے ساتھ گا رہے تھے۔ نوجوانوں کی ایک جماعت ''ماریں گے، مر جائیں گے'' سوشلزم لائیں گے'' کے نعرے بلند کر رہی تھی۔ مسٹر بھٹو ہاتھ ہلا ہلا کر لوگوں کی محبت اور عقیدت کا جواب دے رہے تھے اور میں اور امان اللہ بھی پیدل جلوس کے ساتھ آ رہے تھے اور صدر پہنچتے پہنچتے اتنے تھک گئے کہ مزارِ قائد تک پیدل پہنچنے کی ہمت باقی نہیں رہی۔ سکوٹر اور ٹیکسی تلاش کی تو معلوم ہوا کہ اس رہگذر پر آج کوئی سواری ملنا ممکن نہیں۔ چار و ناچار پیدل جلوس کے ساتھ چلتے رہے۔ جب مسٹر بھٹو کا جلوس چینی سفارت خانے کے سامنے سے گذرا تو جلوس میں شامل لوگوں نے جمہوریہ چین کے نعرے بلند کئے اور مسٹر بھٹو نے اپنے گلے سے پھولوں کے ہار اتار اتار کر چینی سفارت خانے کی طرف پھینکنا شروع کر دیئے۔ صدر بازار میں کچھ لوگوں نے جلوس پر پتھر پھینکے، لیکن بھٹو اور اس کے ساتھی اطمینان کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ جب جلوس مزارِ قائد کے قریب پہنچ گیا، تو صدر سے دھوئیں کے مرغول اٹھتے ہوئے دکھائی دیئے۔ معلوم ہوا کہ جلوس کے آخری حصے میں شامل لوگوں اور پٹھانوں کے درمیان زبردست تصادم ہوا ہے اور صدر کی بہت سی دکانیں جلا دی گئی ہیں۔ درجنوں سکوٹروں اور موٹروں کو بھی تباہ کیا گیا ہے۔ کراچی اتنا بڑا شہر ہے کہ صدر بازار کی اس سنگین واردات کا شہر کے دوسرے حصوں پر اس وقت کوئی اثر نہیں پڑا۔ لیکن دوسرے دن تقریباً سارے شہر میں ہڑتال رہی۔ بعض علاقوں میں پولیس نے چوبیس گھنٹے کا کرفیو نافذ کر دیا۔ سوا چار بجے کے قریب بھٹو کی سواری قائد اعظم کے

مزار پر پہنچ گئی اور یہاں تقریباً پچاس ہزار لوگوں کے اجتماع میں اس نے تقریر کی۔ وہ اردو صاف نہیں بولتا، لیکن اردو میں اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح بیان کر سکتا ہے۔ اس نے اپنی مختصر سی تقریر میں لوگوں کو یاد دلایا، کہ پاکستان میں موجودہ انقلاب کا بانی میں ہی ہوں اور اس انقلاب کو اس کے منطقی انجام تک بھی میں ہی پہنچا سکتا ہوں۔ مجمع میں کچھ لوگوں نے کہا کہ ہمیں تاشقند کے متعلق بتائیے کہ وہاں کیا ہوا؟ تو بھٹو نے جواب دیا ''تاشقند تو بہت پرانی بات ہے، اس کے متعلق سن کر اب کیا کریں گے، اب تو اس ملک میں نئے تاشقند کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور آپ کو اس کے متعلق خبردار رہنا چاہیے''۔ آخر میں بھٹو صاحب نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسا کر دونوں بازوں کو مخالف سمتوں میں کھینچنا شروع کر دیا اور ہزاروں لوگوں نے تالیاں بجا بجا کر اپنے ہیرو کی اس اداکاری کی داد دی۔ اس کا مقصد تھا، کہ زنجیریں ٹوٹ گئی ہیں اور یہ ہم نے توڑ دی ہیں۔ اس کے بعد مسٹر بھٹو نے اپنی ایک ٹانگ ہوا میں اچھال دی۔ تو چاروں طرف سے مسٹر بھٹو زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے اور بھٹو نے دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے مڑ کر چار بار اپنی ٹانگ ہوا میں اچھال دی۔ میں مسٹر بھٹو کی قابلیت، ان کی خطابت اور جذباتیت کا شہرہ سن چکا تھا۔ اب جوان کو پہلی بار دیکھا، تو محسوس ہوا کہ ان میں سب کچھ ہے، مگر سنجیدگی نہیں ہے۔ وہ مجمع کو دیکھ کر جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں اور سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے آداب، اصول اور اخلاق کو بھی پاؤں تلے روند سکتے ہیں۔ بھٹو کی اسی جذباتیت نے انہیں پاکستان کے نوجوانوں میں سب سے مقبول لیڈر بنا دیا تھا۔ لیکن پاکستان کا سنجیدہ طبقہ ان کی قیادت پر کبھی ایمان نہیں لایا اور جوں جوں پاکستانی سیاست کے اندرونی

تضادات نمایاں ہونے لگے۔ بھٹو صاحب کا سیاسی مستقبل بھی غیر یقینی بنتا گیا۔ چند دن بعد شورش کاشمیری نے مجھے بتایا کہ "بھٹو صاحب اس سارے انقلاب کو اپنے سیاسی عزائم کی تکمیل کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں" اور کم و بیش تمام پاکستانی لیڈروں کی بھٹو کے متعلق یہی رائے تھی!

بھٹو صاحب کی تقریر سننے کے بعد ہم میمن مسجد دیکھنے گئے۔ یہ مسجد فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہونے کے لیے علاوہ میمن فرقے کی دولت و ثروت کا عالیشان مظاہرہ ہے اور میں نے اتنی شاندار مسجد پہلے کبھی نہیں دیکھی ہے۔ شام کو ڈاکٹر عبدالغنی سے ملاقات ہوئی۔ غنی صاحب میرے آبائی گاؤں ناسنور کے رہنے والے ہیں اور سکول میں میرے ہم جماعت تو نہیں، میرے ہم عصر رہے ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں وہ ماں، باپ، بھائی بہن سب کو چھوڑ کر پاکستان پہنچ گئے۔ یہیں شادی کی اور پھر "ڈاکٹر" ہو گئے۔ اب انہیں بے طرح وطن کی یاد آرہی ہے اور وہ کسی صورت سے گھر لوٹنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ کراچی میں ناسنور کی ایک لڑکی بھی بیاہی ہوئی ہے اور انہوں نے جس لڑکی کا نام لیا، میں اُسے جانتا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اس سے بھی مل لینا چاہیے۔ بچاری بیس بائیس برس بعد اپنے کسی ہم وطن کو دیکھ کر خوش ہو جائے گی۔ وہ شہر سے بہت دور دستگیر کالونی میں رہ رہی تھی۔ اس لیے غنی صاحب اور میں ٹیکسی میں سوار ہو کر ناظم آباد کی طرف چل دئے۔ باتوں باتوں میں غنی صاحب نے بتایا کہ غلام احمد ناز (کولگامی) ناظم آباد میں رہتے ہیں۔ ناز صاحب سے میری خط و کتابت تو تھی، لیکن میں اس سے پہلے ان سے کبھی نہیں ملا تھا۔ میں نے کہا، پہلے ناز صاحب سے ملیں گے۔ اتفاقاً ناز صاحب گھر پر ہی موجود تھے۔ میں ان کی جو تصویریں دیکھی تھیں ان میں وہ دُبلے، پتلے، معقول

شکل وصورت کے آدمی نظر آتے تھے، مگر اب جن صاحب کو میں نے دیکھا، وہ بڑے موٹے اور ڈیل ڈول والے آدمی دکھائے دیئے۔ ناز صاحب نے اس محبت سے مجھے گلے لگایا، کہ جیسے ان کا کوئی بہت پرانا دوست مل گیا ہو۔

''میں نے جب تمہیں دیکھا ہے، تو تم اتنے سے تھے'' ناز صاحب نے فرش اور اپنے ہاتھ کے درمیان ایک ڈیڑھ فٹ کا فاصلہ رہنے دیا، وہ آج بے حد خوش نظر آرہے تھے، آج ہی کشمیر سے ان کا بھائی یعقوب بھی آگیا تھا اور وہ بائیس برس بعد اپنے بھائی سے ملے تھے، اس کے بعد ناز صاحب نے مختصر طور اپنی زندگی کی روداد سنائی وہ پاکستان آکر کچھ دنوں تک بہت پریشان رہے۔ اس پریشانی سے گھبرا کر وہ لندن گئے وہاں سے بیرسٹر ایٹ لاء ہوکر آ گئے۔ شادی کی، لیکن یہ شادی ناکام رہی۔ اب ایک ڈاکٹر خاتون سے شادی کی ہے اور خدا کے فضل سے اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ خود کسی بہت بڑی فرم میں قانونی مشیر ہیں اور ہزار دو ہزار روپے تنخواہ پاتے ہیں۔

میں نے پوچھا کہ شاعری کا کیا ہوا؟ تو ناز بہت جذباتی ہو گئے، کہنے لگے کہ مجھے کشمیر کی نہیں، کشمیری زبان کی یاد نے مار ڈالا ہے۔ مجھے اپنی جگہ بڑا زعم تھا کہ میں کشمیری شاعری میں کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دوں گا۔ لیکن اس غریب الوطنی میں اپنی زبان کے ارتقاء سے بھی واقف نہیں ہوں۔ کشمیری زبان میں اقبال کی اسرار خودی کا ترجمہ کیا ہے۔ ابھی تک اسے شائع نہیں کیا ہے، کہ یہاں اس کی قدر کون کرے گا۔ تم اگر اس کو وہاں چھپوا دو تو مجھے خوشی ہوگی''۔ اس کے بعد سیاست کا موضوع چھڑ گیا، ناز کا خیال ہے کہ پاکستان ہندوستان کے مقابلے میں زیادہ سیکولر ملک ہے کیونکہ یہاں ہندوستان کی طرح آئے دن فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہوتے۔ میں نے کہا اس کا سبب یہ

ہے، کہ پاکستان میں ہندو کوئی سیاسی حیثیت نہیں رکھتے۔ جب کہ ہندوستان میں مسلمان ایک موثر سیاسی قوت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے بعد آناز کو پریم ناتھ بزاز کی یاد آئی اور وہ بہت دیر تک ان کے متعلق پوچھتے رہے۔ یہاں سے ناز کو لے کر ہم لیاقت آباد کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں معلوم ہوا کہ وہاں گولی چلی ہے اور وہاں کے حالات بہت مخدوش ہیں۔ جوں توں کر کے ہم دستگیر کالونی پہنچ گئے اور میں امۃ الرحیم اور ان کے میاں چودھری مبارک احمد سے ملا۔ مجھے دیکھ کر امۃ الرحیم کو حیرت زیادہ ہوئی یا مسرت؟ اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔

رات کو غلام محمد لون کے ہاں کھانے کی دعوت تھی۔ جہاں بہت سے کشمیری احباب سے ملاقات ہوئی اور رات گئے تک اجنبی دیار میں ارباب وطن کی یہ محفل جمی رہی۔

دوسرے دن میں اور قیوم صاحب کیماڑی کی طرف گئے۔ کیماڑی کراچی کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ یہاں سے ہم موٹر لانچ میں بیٹھ کر منوڑا گئے، منوڑا کیماڑی سے دو میل کے فاصلے پر ایک جزیرہ ہے۔ یہ سمندر کی سطح پر میری پہلی سیر تھی اور زندگی میں پہلی بار، میں نے سمندری جہاز کو اس قریب سے دیکھا۔ چاروں طرف سمندری جہاز لنگر انداز تھے۔ منوڑا کے جزیرے کے چاروں طرف سمندر ہی سمندر ہے اور یہاں زیادہ تر ماہی گیروں کی آبادی ہے اور یہ مچھلیوں کی تجارت کا بہت بڑا مرکز ہے۔

شام کو فیض احمد فیضؔ سے ملنے کے لیے گیا اور وہاں سے واپسی پر ذوالفقار علی بھٹو کی کوٹھی پر میں اپنا کارڈ دے آیا۔ ''جنگ'' پاکستان کا سب سے بڑا اردو روزنامہ ہے۔ اس کی اشاعت ڈیڑھ دو لاکھ سے بھی زیادہ ہے اور یہ

بیک وقت کراچی اور راولپنڈی سے شائع ہوتا ہے۔ ''جنگ'' کا دفتر میر قیوم کے مکان سے کچھ ہی فاصلے پر واقع ہے۔ قیوم صاحب اور ان کے برادر منان نے بتایا کہ وہ ''جنگ'' کے ایڈیٹر کو بھی جانتے ہیں۔ میں نے دفتر دیکھنے اور ایڈیٹر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو قیوم صاحب نے وہاں ٹیلی فون کر دیا اور کچھ دیر بعد ہم دفتر ''جنگ'' میں تھے۔

جنگ کی عمارت دیکھ کر مشکل سے یقین آتا ہے کہ یہ کسی اردو روزنامے کا دفتر ہو سکتا ہے۔ عالیشان چہار منزلہ عمارت اور اندر سے یوں سجی سجائی ہوئی کہ مجھے بے حد رشک آنے لگا۔ ایڈیٹر صاحب ابھی تشریف نہیں لائے تھے۔ اس لیے ''جنگ'' کے مشہور کالم نویس انعام دُرانی سے ملاقات ہوئی۔ درانی صاحب روزانہ طنزیہ کالم لکھتے ہیں اور ان کا شمار اچھے کالم نویسوں میں ہوتا ہے۔ مجھ سے ملاقات کے وقت وہ بڑے ہی ''تباہ کن'' موڈ میں تھے، معلوم ہو رہا تھا کہ صبح ہی صبح دختر رز سے شناسائی حاصل کی ہے۔

مجھ سے مخاطب ہو کر بڑی بے تکلفی سے یوں گویا ہوئے۔

''اچھا تو آپ کشمیر سے تشریف لائے ہیں، خوب، سنا ہے کہ پچھلے بیس برسوں سے وہاں بڑی ترقی ہوئی ہے اور وہاں کے لوگ بالکل مطمئن ہیں''۔

''سب لوگ تو مطمئن نہیں ہیں لیکن خاصی ترقی ہوئی ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے''۔ میں نے انکسار سے جواب دیا۔

ارے دس پندراں دن ہمارے ساتھ رہ جائیں گے تو پھر خود ہی مطمئن بھی ہو جائیں گے'' درانی صاحب نے زہر خنداں کے ساتھ کہا۔

اس دوران ایڈیٹر صاحب تشریف لائے۔ ان سے مختصر سی ملاقات کے بعد میں میر منان صاحب کے ساتھ لی، مارکیٹ گیا۔ یہاں امان اللہ صاحب

ایک پرائیویٹ کالج چلاتے ہیں اور خود اس کالج کے پرنسپل ہیں۔ مجھے چونکہ ڈھاکہ جانے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اس لیے میں نے یہاں سے ڈھاکہ کے لیے ٹرنک کال بک کر دی۔ ڈھاکہ میں میری ایک چچازاد بہن بیاہی ہے اور میں اس سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ تھوڑی دیر انتظار کے بعد ڈھاکہ کی لائن مل گئی اور بیس برس بعد میں اپنی بہن سے صرف ٹیلی فون پر ہی بات کر سکا۔

رات کے ہوائی جہاز سے میں لاہور جا رہا تھا اور ہوائی اڈے پر بہت سے کشمیری دوست احباب مجھے وداع کرنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ جہاز کی روانگی سے دو تین منٹ پہلے میر منان نے مجھے ایک صاحب سے متعارف کیا۔

''یہ ہیں مجید نظامی، ''نوائے وقت'' کے ایڈیٹر۔ یہ بھی آپ کے ساتھ لاہور جا رہے ہیں''۔

''نوائے وقت'' اس وقت پاکستان کا سب سے مقبول اخبار تھا۔ اس کی جرأت و بے باکی نے اسے صدر ایوب کے دور میں معتوب و مقہور بنایا تھا اور یہ پاکستان کا واحد اخبار تھا، جس نے صدر اور اس کے آمرانہ نظام کی اطاعت قبول نہیں کی تھی۔ مجید نظامی، پاکستان کے مشہور ادیب اور صحافی حمید نظامی کے بھائی ہیں اور اپنے بھائی کی وفات کے بعد انہوں نے ہی نوائے وقت کی ادارت سنبھالی ہے۔

مجید نظامی جہاز میں میرے ہی ساتھ والی نشست پر آ کر بیٹھ گئے اور دو گھنٹے کے اس سفر میں ہم نے پاکستان کے موجودہ انقلاب کے متعلق مفید تبادلۂ خیال کیا۔

مجید نظامی ذوالفقار علی بھٹو کے سخت مخالف ہیں۔ اور ان کی باتوں سے ایسا لگا کہ وہ بھٹو کو پاکستان کے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھتے ہیں۔ وہ دراصل کٹر قسم کے مسلمان ہیں اور انہیں بھٹو صاحب کے سوشلزم اور ان کی چین نوازی سے چڑ ہے۔ انہیں شکایت تھی کہ یہ شخص جو صرف دو سال پہلے صدر ایوب کا سب سے بڑا قصیدہ خواں تھا، آج ان کے خلاف بغاوت اور انقلاب کا سب سے بڑا علمبردار بنا پھرتا تھا۔ ان کا خیال تھا، کہ بھٹو کی حد سے بڑی ہوئی انانیت مخالف جماعتوں کو کبھی متحد ہونے کا موقع نہیں دے گی۔ مجید نظامی نے کہا کہ بھٹو کی غیر سنجیدہ حرکات اور اسکی خودنمائی، اس کے عبرتناک سیاسی انجام کو یقینی بنائیں گے۔ گفتگو کے دوران کشمیر کا بھی ذکر آیا۔ نظامی صاحب کو اس بات کا سخت افسوس تھا، کہ پاکستانی حکمرانوں کی کوتاہ اندیشی، خودغرضی اور حماقت کی وجہ سے کشمیر ابھی تک پاکستان کا حصہ نہیں بن سکا ہے۔ انہوں نے صدر ایوب پر الزام لگایا کہ وہ کشمیر کے معاملے میں بالکل سرد مہر اور غیر سنجیدہ ہیں۔ بلکہ وہ کشمیر کو پاکستان کے ساتھ شامل کرنے کے حق میں ہی نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ پھر ۱۹۶۵ء کی جنگ کس نے شروع کی، تو نظامی صاحب نے اس کا بڑا دلچسپ جواب دیا۔ انہوں نے کہا کہ لڑائی دراصل قادیانیوں نے شروع کروائی۔ صدر ایوب نے قادیانیوں کو فوج میں بڑے بڑے عہدے دے رکھے ہیں اور قادیانیوں کے امام مرزا البشیر الدین احمد نے پیشن گوئی کی ہے کہ ہم قادیان کو دوبارہ حاصل کریں گے۔ اپنے امام کی پیشن گوئی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے قادیانی فوجی افسروں نے کشمیر کو فتح کرنے کی ٹھان لی، میں اس سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ صدر کے خلاف ایک الزام میرزائی (قادیانی) ہونے کا بھی تھا۔ نظامی صاحب کی تشریح سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ پاکستان

میں قادیانیوں کے خلاف کس درجہ نفرت اور عداوت کا جذبہ موجود ہے۔ اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ جمہوری مجلسِ عمل کے تقریباً سبھی لیڈر ۱۹۵۳ء میں ختم نبوت تحریک کے لیڈر بھی تھے۔ اور مجید نظامی کے بھائی حمید نظامی اس تحریک میں پیش پیش تھے۔

میں نظامی صاحب سے باتوں میں محو تھا، اور ائیر ہوسٹس کچھ مسافروں کی تواضع میں مصروف تھی۔ معلوم ہوا کہ کچھ مسافر بادۂ انگور سے طبیعت بہلا رہے ہیں۔ نظامی صاحب کو ائیر ہوسٹس کی ساقی گری پر بڑا غصہ آیا۔ انہوں نے اسے بلا کر پوچھا کہ کیا ہوائی جہاز میں شراب کے لیے پرمٹ کی پابندی نہیں ہے۔ ہوسٹس نے انہیں بتایا کہ رات کی سروس میں مسافروں کے لیے پرمٹ کی پابندی ختم کر دی گئی ہے۔ نظامی صاحب اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئے اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہوسٹس کے جواب سے انہیں سخت جذباتی صدمہ پہنچا، دراصل پاکستان بھر میں شراب نوشی منع ہے اور صرف وہی لوگ شراب پی سکتے ہیں جن کے پاس ڈاکٹری سرٹیفکیٹ موجود ہو کہ ان کو طبی ضروریات کے لیے شراب پینے کی اجازت ہے۔

رخصت ہونے سے پہلے نظامی صاحب نے مجھ سے کہا کہ وہ کل مجھے لاہور کے کچھ صحافیوں سے ملائیں گے۔

آخری قسط

اب لاہور کی حالت پہلے سے بہتر تھی، جلسے جلوس روزمرہ کا معمول بن چکے تھے اور تشدد کے واقعات میں برابر کمی ہوتی جا رہی تھی۔ مال روڈ اور انار کلی میں غیر معمولی چہل پہل نظر آرہی تھی اور ایسا محسوس ہورہا تھا کہ شہر کے لوگ آئے دن کے ہنگاموں سے تنگ آکر اب روزمرہ کے کاروبار سے دلچسپی لینے لگے ہیں۔ ۲۱ رفروری کی صبح کو صدر ایوب کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ وہ شام کو ساڑھے پانچ بجے ایک اہم تقریر نشر کرنے والے ہیں۔ صدر کے اس اعلان کے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہورہی تھیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ملک میں مارشل لاء نافذ کرنے والے ہیں اور بعض لوگوں کا اندازہ تھا کہ وہ صدارت سے دستبردار ہونے کا اعلان کریں گے۔ مجھے مجید نظامی (ایڈیٹر نوائے وقت) نے شام چار بجے مال روڈ پر واقع انڈس ریستوران میں چائے پر مدعو کیا تھا۔ چار بجے میں انڈس پہنچا۔ تو نظامی صاحب میرا انتظار کررہے تھے۔ کچھ دیر بعد شورش کاشمیری تشریف لائے۔ ان کے ساتھ مشہور کالم نویس م۔ش۔ صاحب بھی تھے۔ نظامی صاحب نے میرا تعارف کیا تو م۔ش۔ صاحب اچھل پڑے، معلوم ہوا کہ وہ ''آئینہ'' بڑی باقاعدگی سے پڑھ رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کو کہاں سے ملتا ہے، تو انہوں نے سرگوشی کے انداز میں کہا، کہ یہ بات بتانے کی نہیں۔

''آپ اکیلے آئے ہیں یا چراغ بیگ بھی ساتھ آئے ہیں، میں تو آپ

سے زیادہ چراغ بیگ کا مداح ہوں''۔م۔ش۔صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''فی الحال تو میں آیا ہوں، شاید کبھی چراغ بیگ بھی آ سکیں''۔م۔ش۔ صاحب شیخ صاحب کے زبردست مداح ہیں۔ اُنھوں نے ان کے متعلق بار بار دریافت کیا کہ وہ کیسے ہیں کیا کر رہے ہیں؟ مجید نظامی نے کہا کہ م ش صاحب نے شیخ صاحب کی شان میں اتنے قصیدے لکھے ہیں کہ اب وہ صرف اس انتظار میں ہیں کہ ان کا مرثیہ بھی لکھ ڈالیں۔ اس پر شورش کو ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد کے جنازے میں شرکت کرنے کے لیے میں دلی گیا تو وہاں بخشی غلام محمد سے ملاقات ہوئی۔ بڑی محبت سے بغل گیر ہوئے اور کہا پھر کب ملو گے؟ چلو کچھ دنوں کے لیے کشمیر چلو، تو میں نے جواب دیا ''میں ابوالکلام آزاد کے جنازے پر آیا ہوں، اپنے جنازے پر نہیں''۔

م۔ش نے ایک بار پھر شیخ صاحب کا ذکر چھیڑا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ شیخ صاحب کو واقعی مذہب کا درد ہے اور وہ اسلام کے سچے پیروکار ہیں اور اسی لیے مجھے ان سے بے پناہ عقیدت ہے''۔م۔ش۔صاحب کو اس بات کا سخت اندیشہ تھا کہ کہیں کشمیری مسلمانوں کو ختم کرنے کا کوئی منصوبہ کامیاب نہ ہو جائے۔ میں نے انہیں اطمینان دلایا کہ اس بات کا کوئی خطرہ نہیں اور وہ بے فکر رہیں۔

''اگر کشمیر پاکستان کا حصہ ہوتا، تو شیخ عبداللہ آج کہاں ہوتے''۔ شورش نے مجید نظامی اور م۔ش سے مخاطب ہو کر کہا۔

''جیل میں'' مجید نظامی نے کہا اور سب نے اتفاق کیا۔

اس کے بعد شورش نے اپنی حالیہ نظر بندی کے واقعات سنائے کہ کس

طرح انہوں نے جیل میں بھوک ہڑتال کر کے جیل کے افسروں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور پھر رہائی کے بعد سے اب تک اپنی سرگرمیوں کی روداد بیان کی۔ شورش کا انداز بیان اتنا دلچسپ تھا کہ ہم سب ان کی باتوں میں کھو گئے اور کسی کو وقت کا احساس ہی نہیں رہا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ مولانا آزاد کے پرستاروں میں سے ہیں اور اس وقت جب کہ پاکستان میں مولانا آزاد کا نام لینا بھی کفر تھا انہوں نے ''چٹان'' کا ابوالکلام آزاد نمبر نکالا تھا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ پاکستان میں مولانا آزاد کی علمی، دینی، صحافتی اور ادبی عظمت کا احساس عام کرنے میں انہوں نے بڑی جرات اور بے باکی سے کام لیا ہے۔ ''چٹان'' کی دوبارہ اشاعت کی اجازت مل گئی تھی اور شورش کاشمیری ان دنوں پہلے شمارے کی ترتیب و تدوین میں مصروف تھے۔ انہوں نے کہا کہ پہلا شمارہ انقلاب نمبر ہوگا اور اس کی ڈیڑھ لاکھ کاپیاں چھاپی جا رہی ہیں۔ ساڑھے پانچ بجنے میں صرف کچھ منٹ باقی رہ گئے تھے اور سب لوگ صدر کی تقریر سننے کے لیے اپنے اپنے دفتروں تک پہنچنے کے لیے بے قرار تھے۔ رخصت ہونے سے پہلے م۔ش نے دوسرے دن صبح کے لیے ناشتے کی دعوت دی اور شورش اور مجید نظامی سے بھی شریک ہونے کی درخواست کی۔

''یہ تمہارے گھر پر ناشتے کی دوسری دعوت ہوگی، پہلی دعوت خان عبد الغفار خان کو دی تھی''۔ شورش نے م۔ش کے ناشتوں کی تاریخ بیان کی۔

صدر ایوب نے اپنی نشری تقریر میں غیر متوقع طور پر اس بات کا اعلان کر دیا کہ وہ آئندہ صدارتی انتخاب میں امیدوار نہیں ہوں گے۔ انہوں نے پاکستان کے لوگوں کو اس بات کا یقین دلایا کہ ان کا یہ فیصلہ آخری اور حتمی ہے۔ صدر کے اس اعلان سے عام لیڈروں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ان کا

خیال تھا کہ صدر آئندہ انتخاب میں پھر امیدوار ہوں گے اور اس طرح وہ مزید پانچ سال کے لیے پاکستان پر مسلط رہیں گے۔ صدر ایوب کے سرکاری مسلم لیگ کے دوبارہ صدر چنے جانے سے اس شبہ کو تقویت مل گئی تھی لیکن اب صدر کے قطعی اعلان کے بعد یہ مشکل حل ہوگئی تھی اور مجلس عمل کے ایک لیڈر کے بقولِ عوام نے آدھی جنگ جیت لی تھی۔ اس شام میں آزاد کشمیر کے سابق صدر اور لبریشن لیگ کے موجودہ صدر کے ایچ خورشید سے ملنے کے لیے گیا۔ خورشید صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ لیکن وہ مجھ سے غائبانہ طور متعارف تھے اور انہیں پاکستان میں میری آمد کا علم تھا۔ خورشید صاحب کے متعلق میں نے سنا تھا کہ وہ بہت ذہین، خوددار اور سلجھے ہوئے آدمی ہیں۔ وہ آزاد کشمیر کے پہلے صدر تھے، کہ جنہوں نے وزارتِ امور کشمیر کا ٹوڈی ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ جتنی دیر تک صدر رہے، باضابطہ صدر رہے اور انہوں نے اپنے اختیارات میں وزارتِ امور کشمیر کے سیکریٹری کو مداخلت نہیں کرنے دی۔ لیکن انہیں اپنی خودداری اور خودمختاری کی قیمت چکا پڑی اور ۱۹۶۴ء میں انہیں اس جرم کی پاداش میں گرفتار کیا گیا کہ انہوں نے شیخ صاحب کے دورہ پاکستان کے دوران ان سے مل کر کشمیر کو آزاد اور خودمختار بنانے کی سازش کی۔ کے ایچ خورشید نے اس الزام کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ الزام لگانے والوں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ اس سازش میں شیخ صاحب کو بھی شریک کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان ہو یا ہندوستان، کشمیریوں نے خود اپنے وقار کو خاک میں ملا دیا ہے۔ یہ بات پاکستان میں مقیم کشمیریوں کے حق میں زیادہ صحیح ہے، کے ایچ خورشید کے خیال میں آزاد کشمیر کے لوگوں کو پہلے اس بات کا مطالبہ کرنا چاہیے کہ آزاد کشمیر ایک آزاد اور خودمختار ریاست ہے۔ پھر ایک آزاد مملکت کی

حیثیت سے دنیا کی تمام آزادی پسند قوتوں سے امداد طلب کرنا چاہیے اور اس طرح آزادی کی جنگ لڑنا ہوگی۔ خورشید صاحب کی سیاسی جماعت لبریشن لیگ کا یہی سیاسی موقف ہے۔ انہوں نے سٹیٹ پیپلز کنونشن کے قیام کو سراہا لیکن اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ پاکستان میں مقیم کشمیریوں کو اس میں شریک ہونے کا موقع نہیں ملا۔

خورشید صاحب سے رخصت ہو کر میں کشتواڑ کے رجب اللہ طارق سے ملا۔ وہ ایڈوکیٹ ہیں اور ان کا دفتر منزگ روڈ پر میری قیام گاہ کے قریب ہی تھا۔ انہوں نے اپنے دفتر پر کچھ اور دوستوں کو بھی بلایا تھا۔ جن میں پیر حفیظ مانسبلی اور دارا کیانی صاحب کے نام مجھے یاد ہیں۔ محفل میں شریک سبھی دوستوں نے خواہش ظاہر کی کہ وہ کسی طور کشمیر آ سکیں۔ ان کے خیال میں کشمیر کا فوری حل یہ تھا کہ آمد و رفت پر عائد تمام پابندیاں ختم کر دی جائیں، اس کے بعد کوئی مسئلہ باقی نہیں رہے گا۔

شام ۷ بجے کے لیے ایر مارشل اصغر خان سے ملاقات کا وقت طے ہوا تھا۔ میں ٹھیک ۷ بجے ایر مارشل کی کوٹھی پر پہنچا، تو ایک نسبتاً نوجوان آدمی نے میرا استقبال کیا۔ یہ برگیڈیر اسلم تھے۔ اصغر خان کے چھوٹے بھائی اسلم صاحب نے بتایا کہ ایئر مارشل ایک اہم میٹنگ کے سلسلے میں مصروف ہیں اور چونکہ یہ میٹنگ صدر ایوب کے تازہ ترین اعلان پر غور کرنے کے لیے ابھی ابھی بلائی گئی ہے۔ اس لیے اس میں کچھ وقت لگے گا۔ ایئر مارشل صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ سے معذرت کر لوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو کل آ جائیں۔ میں نے کہا کوئی مضائقہ نہیں، میں کل آنے کی کوشش کروں گا۔ برگیڈیر اسلم نہایت بااخلاق اور ملنسار آدمی ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ

۱۹۴۷ء میں بارہمولہ تک آئے تھے۔ انہوں نے تفصیل کے ساتھ اپنی اور پاکستانی فوج کی بہادری کے قصے سنائے۔

۲۲ رفروری کی صبح کو میں ماڈل ٹاون م۔ش۔ صاحب کے ہاں ناشتے کے لیے پہنچا تو معلوم ہوا کہ شورش اور نظامی صاحب ابھی نہیں آئے ہیں۔ م ش صاحب کا خیال تھا، کہ دونوں کا کچھ دیر کے لیے انتظار کیا جائے۔ اس دوران میں انہوں نے مجھے کشمیر اور اہل کشمیر سے اپنے عشق کی روداد سنائی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے راتوں کو اٹھ کر کشمیر کے غم میں آنسو بہائے ہیں۔ انہیں کشمیر سے اس لیے عشق نہیں تھا کہ یہ ایک خوبصورت سرزمین ہے، بلکہ اس لیے کہ کشمیر کے مسلمان بڑے مذہب پرست اور دیندار لوگ ہیں۔ میں نے ان کے خیالات کی نہ تائید کی اور نہ تردید۔ میں بڑے غور سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ کشمیر ایک دن آزاد ہوکر ایک مثالی اسلامی سلطنت بن جائے گا۔ اسی دوران میں شورش اور مجید نظامی بھی آگئے۔ ناشتے کی میز پر باتوں کا سلسلہ جاری رہا، میں نے م ش سے مخاطب ہوکر کہا کہ آپ کو کشمیری مسلمانوں سے اتنی ہمدردی اور محبت ہے، لیکن ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ ان کے مستقبل کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

”اللہ تعالیٰ ان کا بھی حافظ و ناصر ہے، وہ مسلمان کی ہر حالت میں حفاظت کرتا ہے“۔ م۔ش نے جواب دیا۔

”جب تک ہندوستانی مسلمانوں میں م ش جیسے مسلم لیگی ذہن موجود ہیں۔ ان کا مستقبل تاریک رہے گا“۔ شورش کاشمیری نے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے کہ ہندوستانی مسلمان ہندو سے بالکل مرعوب نہیں

ہے۔ اور ہم جو ہندوستانی اخبارات پڑھتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُسے اپنے اوپر مکمل اعتماد ہے''۔ اس لیے ہمیں اس کے مستقبل کی فکر نہیں کرنا چاہیے''۔ نظامی صاحب نے کہا۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد بہت دیر تک پاکستان کی موجودہ سیاسی صورت حال پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ زیادہ تر باتیں شورش کاشمیری نے ہی کیں اور ہم سب لوگ توجہ سے سنتے رہے۔

رخصت ہونے سے پہلے م ش صاحب نے مجھے بیس پاکستانی روپے دیئے کہ ان کا ''شنکرس ویکلی'' کا چندہ ختم ہوگیا ہے۔ اور میں ان کی جانب سے یہ چندہ جمع کراکر ان کے نام ''شنکرس ویکلی'' باقاعدگی سے بھجواتا رہوں۔

دن میں، میں اعجاز کو لے کر ایک بار پھر مزار اقبال پر گیا۔ اب کی بار ہمارے پاس کیمرہ بھی تھا۔ اور میں نے اقبال کے مزار پر اپنی بہت سی تصویریں کھچوائیں۔ شورش نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے اپنی تصنیفات کا ایک سیٹ دیدیں گے۔ اس لیے میں ''چٹان'' کے دفتر پر گیا۔ اشاعت پر پابندی اٹھنے کے بعد ''چٹان'' کا پہلا شمارہ تیار ہورہا تھا۔ اور دفتر میں شورش کے علاوہ اور بہت سے لوگ جمع تھے۔ وہاں میری ملاقات لاہور مجلس عمل کے سرکردہ رہنما ملک محمد اسلم حیات سے ہوئی۔ حیات صاحب ایڈوکیٹ ہیں اور ایوب کے خلاف ایجی ٹیشن میں پیش پیش تھے۔ شورش کاشمیری نے اپنی آدھ درجن مطبوعات کا ایک سیٹ ''چٹان'' کے کچھ خاص نمبر اور تازہ ترین شمارے مرحمت فرمائے اور میں ان سے رخصت ہوا۔

شام چار بجے حبیب اللہ گکرو نے شیزان کانٹی نینٹل میں میرے اعزاز

میں ایک پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں پاکستانی اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں کے بہت سے نمائندے شامل تھے۔ ککرو صاحب ایوب کے حامیوں میں سے تھے اور لاہور میں فسادات کے دوران ان کی دکان کو بھی معمولی نقصان پہنچا تھا۔ انہیں ایئر مارشل اصغر خان سے یہ شکایت تھی کہ وہ آزاد کشمیر کے لیے جمہوریت کا مطالبہ کیوں کرتا ہے؟ کیونکہ اس طرح پاکستان کے دشمنوں کو پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا موقع ملتا ہے۔ دعوت میں موجود بہت سے اخبار نویسوں نے مجھ سے شیخ صاحب اور ان کے سیاسی نظریات کے متعلق سوالات کئے اور میں نے اپنی مقدور کے مطابق انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ایک اخباری نمائندے نے کہا شیخ صاحب کی تقریروں اور بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دراصل ایک آزاد اور خود مختار کشمیر کے حق میں ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ شیخ صاحب نہ ہندوستانی ہیں اور نہ پاکستانی بلکہ وہ کشمیری ہیں۔ محفل میں موجود ایک بزرگ امیر الدین میاں نے مجھ سے اتفاق کیا۔ امیر الدین صاحب شیخ صاحب کے بہت پرانے واقف کاروں میں سے ہیں۔ انہیں ۱۹۳۱ء سے کشمیر سے دلچسپی رہی ہے اور صادق صاحب، بخشی صاحب اور مولانا مسعودی سبھی لیڈروں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انہوں نے شیخ صاحب کے نام سلام دیتے ہوئے کہا کہ شیخ صاحب سے کہیے کہ آپ تنہا نہیں ہیں، آپ کے ساتھ تمام عالم اسلام کی دعائیں شامل ہیں۔ امیر الدین میاں نے کہا کہ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ پاکستانی عوام کے دل میں اپنے کشمیری بھائیوں کے لیے کس درجہ محبت کے جذبات موجود ہیں۔ پاکستانی عوام کشمیر کی آزادی کے لیے اپنا وجود مٹانے کے لیے بھی تیار ہیں۔ ہم نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں یہ

ثابت کر دیا کہ ہم کشمیر کی خاطر پاکستان کے وجود کو بھی خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہیں۔ اگر ضرورت پڑی، تو ایک بار پھر اپنی جان پر کھیل جائیں گے، کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ جب تک کشمیر پاکستان کا حصہ نہیں بنتا، پاکستان کے قیام کا مقصد پورا نہیں ہوگا۔ میں بڑے سکون اور اطمینان سے میاں صاحب کی تقریر سن رہا تھا۔ دراصل پاکستان میں اپنے قیام کے دوران میں کئی پاکستانی دوستوں اور بزرگوں کی زبانی یہ تقریر سن چکا تھا۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ان مقرروں میں ایک بھی کشمیری نہیں تھا۔

اس شام میں اعجاز کو لے کر بہت دیر تک انارکلی کی سیر کرتا رہا، باتوں باتوں میں، میں نے اعجاز سے پوچھا کہ لاہور کی ہیرامنڈی بہت مشہور تھی وہ اب کس عالم میں ہے۔ اعجاز کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کھل گئی، جیسے کہہ رہا ہو کہ میں تو آپ کو بڑا شریف آدمی سمجھتا تھا۔ میں نے اُسے اپنی شرافت کا یقین دلاتے ہوئے کہا کہ میرا وہاں جانے کا کوئی ارادہ نہیں، میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ پاکستان بننے کے بعد اس کا کیا حشر ہوا۔

''ہیرامنڈی کا وجود اب بھی قائم ہے، لیکن سنا ہے کہ اب وہاں وہ پہلی سی رونق نہیں ہے''۔ اعجاز نے کچھ اس انداز سے کہا کہ جیسے وہ اس موضوع پر بات کرنے میں کوئی جھجھک محسوس کر رہا ہو، اور میں نے موضوع بدل دیا۔

۲۳ر فروری کو پاکستان میں میرے قیام کا آخری دن تھا۔ ۲۴ر کو میرے ویزا کی معیاد ختم ہو رہی تھی اور میں پورے چالیس دن کے بعد گھر لوٹ رہا تھا۔ صبح سویرے اردو ڈائجسٹ کے مدیر اعجاز قریشی تشریف لائے۔ ان کی خواہش تھی کہ میں ڈائجسٹ کے لیے ایک انٹرویو دوں۔ میں نے معذرت ظاہر کی اور قریشی صاحب نے کچھ اس خلوص سے میری معذرت قبول کی، کہ

میں شرمندہ ہوا۔اس کے بعد وہ مجھے سمن آباد میں اپنا دفتر دکھانے کے لیے لے گئے اور اردو ڈائجسٹ کے کچھ چیدہ چیدہ شمارے میری نذر کئے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں سبھی پرانے فائل لے آؤں۔لیکن اتنی ساری کتابیں ساتھ لے جانے کی شاید اجازت نہ ملتی، اس لیے میں نے کچھ سالنامے منتخب کرنے پر ہی اکتفا کی۔ اردو ڈائجسٹ اتنا خوبصورت اور معیاری رسالہ ہے کہ انگریزی زبان کے ریڈرس ڈائجسٹ کے مقابلے میں آسانی کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔ میں نے اردو میں اتنا خوبصورت رسالہ نہیں دیکھا ہے۔

شام کو موچی دروازے کی مسجد کے باہر گراونڈ میں مجلس عمل کے زیر اہتمام پبلک جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا۔جس میں ایئر مارشل اصغر خان پہلی بار لاہور کے عوام سے خطاب کر رہے تھے۔ یہ صدر کی تازہ ترین نشری تقریر کے بعد مجلس عمل کا پہلا جلسہ تھا اور اس میں پچاس ہزار سے زائد لوگ موجود تھے۔ جلسے میں شورش کاشمیری، جاوید اقبال اور ایر مارشل اصغر خان نے تقریریں کیں۔شورش کی تقریر اس کے اپنے مخصوص انداز میں تھی، لیکن اب کی بار اس کی تقریر جمی نہیں۔ معلوم ہو رہا تھا کہ مجمع میں اس کے بہت سے مخالف بھی موجود تھے جو اس کو ہوٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جاوید اقبال (علامہ اقبال کے فرزند) لاہور ہائی کورٹ کے ایڈوکیٹ ہیں اور ان کا شمار پاکستان کے سوشلسٹوں میں ہوتا ہے لیکن ان کی تقریر سن کر خاصی مایوسی ہوئی۔ اسکے بعد ایئر مارشل اصغر خان نے تقریر کی۔ ایئر مارشل بارعب شخصیت کے مالک ہیں اور جب وہ تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو سارے مجمع نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے اپنی تقریر کی ابتداء یوں کی۔

''شورش کاشمیری کا خیال ہے کہ جو آدمی موچی دروازے کے باہر تقریر

کر سکے، وہ پنجاب کا لیڈر ہو جاتا ہے۔ میں پہلی بار آج اس امتحان میں پڑ گیا ہوں، لیکن یقین رکھئے، لیڈر بننے کے لیے نہیں، آپ سے کچھ باتیں کرنے کے لیے"۔ شام کو دیر سے گھر لوٹ آیا۔ تو چچا رحیم اور چچی جان میرا انتظار کر رہی تھیں۔ رات گئے تک باتیں ہوتی رہیں اور دوسرے روز صبح آٹھ بجے میں بھائی بہنوں سے رخصت ہو کر حسینی والا کی جانب چل دیا۔ چچا رحیم اور ان کی بیگم مجھے الوداع کہنے کے لیے حسینی والا تک میرے ساتھ آئے اور ۹ بجتے بجتے میرے اور ان کے درمیان حسینی والا کی ناقابلِ عبور فصیل حائل ہو چکی تھی۔ فصیل کے اس پار وہ لوگ آنسو بہا رہے تھے اور ادھر میں اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔ ہم بائیس برس کے بعد مل کر اب پھر ایک بار بچھڑ رہے تھے۔ ہم میں سے کسی کو یقین نہ تھا کہ پھر کب مل سکیں گے؟ ملیں گے بھی یا نہیں؟

غنڈے

حبیب جالب

غنڈوں کی پشت پر ہیں کچھ باوقار غنڈے
سرمایہ دار غنڈے جاگیر دار غنڈے
غنڈوں سے کام لینا لعنت ہے اک پرانی
انگریزوں نے بھی پالے تھے بے شمار غنڈے
ہم کو نظام زر نے دی یہ سیاہ نشانی
کرتے ہیں اہل زر کا سب کاروبار غنڈے
طاقت اگر ہے آؤ ہم سے نظر ملاؤ
کہتے ہیں روز آکر یہ بار بار غنڈے
غنڈوں کے ہاتھ سے اب تلوار چھین بھی لو
کرتے رہیں گے ورنہ عزت پہ وار غنڈے
کس درجہ ہوگیا ہے دشوار رہ چلنا
آکے ہوئے یہاں ہیں ہر رہگذار غنڈے
دولت بھی لوٹتے ہیں عزت بھی لوٹتے ہیں
ظلم و ستم سے پھر بھی ہیں ہمکنار غنڈے
اٹھو وطن پرستو غیرت کا ہے تقاضا
کردیں نہ اس چمن کو نذرِ شرار غنڈے

❀❀❀

کشمیر کے ذرائع ابلاغ کے نام

یہ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ ملک کے بعض اخبارات نے بالعموم اور ریڈیو کشمیر نے بالخصوص پاکستان اور پاکستانی مقبوضہ کشمیر سے متعلق میرے تاثرات کو غلط رنگ میں پیش کر کے مجھ سے کچھ ایسی باتیں منسوب کی ہیں جو میں نے نہیں کہی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ملک کے عوام کو پاکستان کے حالیہ انقلاب کے متعلق صحیح اطلاعات فراہم کرنے کی غرض سے میں نے کچھ اخباری نمائندوں کے سوالات کے جوابات دئے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی ہے کہ بعض اخبارات نے صحافتی آداب ور اخلاقی تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر میرے بیانات کو اس طرح توڑ مروڑ کر رکھ دیا ہے کہ کچھ باتیں واقعاتی طور پر غلط ہونے کے باوجود مجھ سے منسوب کی گئی ہیں۔ مثلاً دلی کے بعض اخبارات میں مجھ سے یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ مجھے اپنے رشتے داروں سے نہیں ملنے دیا گیا۔ یہ بات غلط اور بے بنیاد ہے۔ کچھ اخبارات میں میری سوجھی ہوئی ٹانگ کا ذکر بھی کچھ اس انداز سے کیا گیا ہے کہ جیسے پاکستانی حکومت نے مار مار کر میرا بھُرکس نکال دیا ہو حالانکہ میری ٹانگ پر جو معمولی سا زخم ہے وہ ۱۴ار فروری کو لاہور میں ایک جلوس پر لاٹھی چارج ہوتے وقت میری ''بھاگ دوڑ''

کا نتیجہ ہے۔ لاٹھی چارج کا نہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ بد دیانتی ریڈیو کشمیر سرینگر نے کی ہے۔ ریڈیو کشمیر سرینگر نے میرے بیانات کو پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا کے طور پر استعمال کرنے کی غرض سے بالکل ہی مسخ کر کے رکھ دیا ہے اور ستم ظریفی یہ کہ ریاستی اسمبلی میں گورنر کے ایڈرس پر میری کی ہوئی تقریر کو کچھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ تقریر کا اصل مقصد ہی فوت ہو گیا ہے۔ میں نے اپنی تقریر میں یہ کہا تھا کہ پاکستان کو وجود میں لانے کی اصل ذمہ داری ہندوستان کے فرقہ پرست ہندوؤں پر ہے۔ ریڈیو کشمیر کے کچھ فرقہ پرستوں کو یہ بات کچھ ناخوشگوار گذری اور انہوں نے مجھ سے یہ منسوب کیا کہ "پاکستان کی بنیاد نفرت پر ہے۔ اسی طرح میں نے پاکستان اور پاکستانی مقبوضہ کشمیر کی غریب الوطنی کا رونا روتے ہوئے یہ بات کہی تھی کہ باوجود اس کے کہ ان کے پاس بڑی بڑی جائیدادیں ہیں لیکن وہ پھر بھی اپنے وطن لوٹنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ لیکن ریڈیو کشمیر کی نشریات سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ لوگ چونکہ وہاں بھیک مانگ رہے ہیں اس لیے وطن لوٹنا چاہتے ہیں۔ ریڈیو کشمیر اور اخبارات کو پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا پورا حق حاصل ہے میں جو کچھ کہوں گا پوری ذمہ داری سے کہوں گا اور یقیناً صحیح واقعات اور حالات کی روشنی میں کہوں گا اور ان باتوں سے اگر پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا کی صورت پیدا ہوتی ہے تو ریڈیو کشمیر شوق سے انہیں استعمال کرے لیکن مجھ سے غلط باتیں منسوب کر کے اخبارات اور ریڈیو اخلاق اور شرافت کے مسلمہ تقاضوں کے ساتھ زیادتی کے مرتکب نہ بنیں۔

❁❁❁

پاکستان سے واپسی پر آئینہ میں شائع پاکستان کے سفرنامے کے تعلق سے پاکستان سے وصول ہوئے مراسلوں میں مِلا جُلا ردِعمل تھا، قارئین کی دلچسپی کے لیے یہ مراسلے من وعن شائع کیے جا رہے ہیں۔

محترم شمیم احمد شمیم صاحب!

سلام مسنون۔

یہ امر ہمارے لیے باعث صد مسرت اور فخر تھا کہ آپ نے گذشتہ دنوں پاکستان کا دورہ کیا۔ آپ کی گوناگوں مصروفیات کے بارے میں ہر وقت اخبارات میں پڑھتا رہتا تھا۔ مجھے امید کامل تھی کہ جناب راولپنڈی کا دورہ ختم کرکے پشاور بھی ضرور تشریف لائیں گے اور اس طرح ہمیں بھی آپ کے نیاز حاصل ہوجائیں گے لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ میں بذات خود راولپنڈی آکر جناب کی خدمت میں حاضر ہوتا لیکن بدقسمتی سے انہی دنوں میں سخت بیمار پڑ گیا اور راولپنڈی نہ آسکا، جس کی وجہ سے آپ کے دیدار بھی نہ ہوسکے۔ پچھلے ہفتے قریشی محمد یوسف صاحب کے بلانے پر میں راولپنڈی گیا تھا۔ قریشی صاحب سے رات بھر باتیں ہوتی رہیں۔ ہماری گفتگو کا موضوع آپ ہی کا ذکر خیر رہا۔ ایسا دکھائی دیا جیسے آپ ہی سے ملاقات ہوئی ہو۔ گذشتہ تین سال سے جو نا امیدی مجھے کشمیر کے رہنماؤں اور نوجوانوں کے کھوکھلے افعال اور کردار کی وجہ سے ہوئی تھی، اُسے آپ کی شخصیت نے یکسر ختم کردیا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے نیک عزائم، بلند کردار اور اقدام سے مجھے بڑا حوصلہ اور خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز

کرے اور آپ کے عزائم کو تقویت بخشے۔ آمین ثم آمین۔ عین ممکن ہے کہ آپ خاکسار کے متعلق کچھ زیادہ نہ جانتے ہوں لیکن مجھے پوری امید ہے کہ جناب کے بزرگوار صاحبان میری قومی خدمات کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوں گے اور آپ کو ضرور اُن کے بارے میں آگاہ کریں گے۔ پھر بھی اپنے بارے میں مختصراً عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ۶/اگست ۱۹۴۹ء کو حکومت نے بلاوجہ مع اپنے دو ساتھیوں مولوی محمد عبداللہ شوپیانی اور قریشی محمد یوسف کے ساتھ پاکستان کی طرف زبردستی دھکیل دیا گیا، یعنی جلاوطن کردیا گیا۔ ۱۹۴۹ء میں جب سے ہمیں گرفتار کر کے جیلوں میں ڈالا گیا، پھر ہمیں جلاوطن کردینے کا حکم دیا گیا، تو ہم نے اُس وقت جیلوں میں زبردست احتجاج کیا تھا کہ ہمیں یہیں اسی جیل میں رہنے دیا جائے۔ ہم کسی دوسرے ملک میں جانے کے لیے تیار نہیں لیکن اس کے باوجود ۶/ اگست ۱۹۴۹ء کو ہمیں زبردستی پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا۔ اس طرح ہم سے ہمارا حق خودارادیت چھین لیا گیا اور ہماری وہ رائے جو آزادی چاہتی تھی اُسے کوئی اہمیت اور وقعت نہ دی گئی۔ ہمیں ظلم و ستم میں مبتلا کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی گئی، لیکن آج شیخ صاحب اُسی حقِ خودارادیت کی مالا جپتے ہیں اور بہ بانگِ دہل اقرار کر چکے ہیں کہ جو کچھ میں نے کیا وہ غلط کیا۔ اُنہوں نے اخبار ''شبستان'' کو انٹرویو دیتے ہوئے بھی کہا تھا کہ میری غلطی اور غلط فہمی کی وجہ سے میرے بہت سے دوستوں کو سخت تکلیف پہنچی اور انہیں مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا۔ اُس کے بعد بخشی حکومت نے بھی ہمارے ساتھ ناروا سلوک کیا یعنی ظلم و ستم کا سلسلہ جاری رکھا۔ اب اس وقت جی۔ ایم۔ صادق صاحب برسر اقتدار ہیں، جن سے انصاف کی توقع کی جاسکتی تھی اور اسی لیے ہم نے ان کی خدمت میں متعدد درخواستیں دی ہیں، کہ ہمیں فقط چند یوم کے لیے اپنے وطن عزیز آنے کی اجازت

دی جائے تا کہ ہم عرصہ دراز سے اپنے بچھڑے ہوئے عزیز واقارب سے ملاقات کر سکیں لیکن ابھی تک ہماری کوئی شنوائی نہیں ہوئی ہے۔ ہمیں شیخ صاحب اور ان کی پارٹی کے افراد کی طرف سے تسلی دی جارہی ہے کہ وہ لوگ جی ایم صادق سے حکومت چھینتے ہی ہم لوگوں کو بلائیں گے۔ اس بات سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اُنہوں نے ہمیں بڑی بے دردی سے اپنی حکومت کے نشے میں شرمسار ہو کر دربدر کیا ہے اور ظاہر ہے جب ایک انسان کو وطن سے بدر کیا جاتا ہے۔ اُس کی خودداری کو فقط زندہ رہنے کے لیے ٹھیس لگنا لازمی ہے لیکن آپ یہ جان کر خوش ہوں گے، کہ میں فقط ایک واحد کشمیری ہوں جس نے اس کسمپرسی اور مصیبت کے وقت میں بھی اپنی خودداری پر آنچ نہیں آنے دی۔ اپنے اور اپنے اہل وعیال کو زندہ رکھنے کے لیے سیاست چھوڑ کر بیرونی ممالک کا رخ کیا اور اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضل وکرم سے اپنے پاؤں پر مضبوطی سے کھڑا ہو گیا اور اپنے اصول پر سختی سے کاربند رہا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کی طرح گداگری نہیں کی بلکہ اللہ پاک کا سہارا لے کر ''ہمت مرداں مدد خدا'' کے مصداق کام کرتا رہا۔ کاش آپ پشاور تشریف لاتے تو مجھ سے مل کر آپ کو یقیناً خوشی ہوتی اور اس کے ساتھ ہی رونگٹے کھڑے کر دینے والے حالات سے آگاہ کر دیتا۔ میں پُر امید ہوں کہ آپ ہمارے لیے پوری محنت کریں گے کہ ہم چند یوم کے لیے اپنے وطن آسکیں، آپ سے ملاقات کر کے مجھے بڑی خوشی ہوگی، جہاں تک حکومت پاکستان کا تعلق ہے، پاکستان نے کشمیریوں کی امداد کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ کشمیری لیڈروں میں زیادہ تر لوگ ایسے تھے (مرحوم چودھری غلام عباس وغیرہ وغیرہ) کہ جنہوں نے زر پرستی، کنبہ پروری اور جاہ پسندی کے سوا کچھ نہیں سیکھا تھا اور ان بدبختوں نے کشمیری مسلمانوں کو یہاں پر

روند ڈالا اور پاکستان کے خزانے کو خالی کیا۔ ان لوگوں نے پاکستان کے حکام کو کشمیریوں سے بدظن کیا۔ کئی کارکنوں کے پیچھے پولیس لگادی گئی۔ کئی کو قید کیا گیا اور ثناء اللہ بٹ ایڈیٹر اخبار ''آفتاب'' کو جلاوطن کردیا گیا۔ آپ بحیثیت ممتاز ایڈیٹر ہماری قوم کا سرمایہ ہیں۔ ہماری آواز ہیں۔ آپ جیسے بے باک نوجوان ہی قوم کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ہمارے جتنے بھی رہنما مقبوضہ کشمیر یا بیرون کشمیر ہیں، ہمارے نزدیک اور نظروں میں سب کو اپنے اپنے وقت تکبر اور غرور کے سوا کچھ نہ آیا اور یہی وجہ ہے کہ ہماری قوم گزشتہ بیس سال سے مصائب اور آلام میں مبتلا ہے۔ میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ جیسے مخلص نوجوان ہمیں عطا کرے، تاکہ ہم اپنی زندگی میں اپنے وطن کی بہار دیکھ سکیں۔ میری طرف سے سب دوستوں کو سلام علیکم۔

آپ کا خیر اندیش

ایم جی رسول، پشاور پاکستان

پیارے شمیم!

آج آپ کا ''آئینہ'' بہت دنوں بعد نظر آیا۔ اب میں ہی نہیں بہت سے لوگ ''آئینہ'' کے انتظار میں یہاں تڑپتے رہتے ہیں۔ کیونکہ آپ کا ''آئینہ'' ہمارے لیے ایک ایسا طلسمی شیشہ بن گیا ہے کہ جس میں کشمیر کے علاوہ پاکستان کے نظارے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ آپ نے ''پاکستان میں چالیس دن'' کے عنوان سے ایک ایسا تاریخی باب کھول دیا ہے کہ جس میں بہت سے نازک مقام آتے ہیں اور آپ جس بے رحمی سے چہرے سے نقاب اُتارتے جارہے ہیں۔ اس نے کئی لوگوں کو خائف اور خوفزدہ کردیا ہے۔ آپ کی تنقید تعریف سے خالی

نہیں، لیکن آپ کی تعریف میں بھی تنقید کا پہلو نمایاں ہوتا ہے اور کبھی کبھی تو آپ قلم سے نہیں نشتر سے لکھتے ہیں اور اس طرح کچھ بچارے لہولہان ہو جاتے ہیں اور افسوس کرنے لگتے ہیں کہ آپ سے ملاقات ہی کیوں کی تھی اور بعض میدان سیاست کے نوآموز کھلاڑی یا پٹے مہرے اب بھی کفِ افسوس مل رہے ہیں کہ آپ سے ملاقات نہ ہوئی کہ دو دو ہاتھ ہو جاتے۔ حالانکہ ان بچاروں کو اپنی خوش قسمتی پر فخر کرنا چاہیے کہ آپ سے نہ مل پائے۔ ورنہ ان کے چہروں سے بھی نقاب الٹ جاتا۔ ان کو نہیں معلوم کہ ''آئینہ'' کے ''ظالم'' مدیر نے اپنے بوڑھے چچا کو بھی نہ بخشا۔ ایک بات کی داد دینا چاہتا ہوں۔ وہ ہے آپ کی ذہانت، معاملہ فہمی، دور اندیشی اور پھر قادر الکلامی اور سلطان القلمی، جو خدائے تعالیٰ نے آپ کو عطا کی ہے۔ یہ ایک نعمت الٰہی ہے اور خدا آپ کے دادا مولانا محمد عبداللہ کو جوارِ رحمت میں جگہ دے، کہ جس کی تمام اولاد میں یہ وراثتاً ودیعت ہے کہ ہر ایک ان میں سے مقرر بھی ہے اور محرر بھی۔ مگر آپ کا درجہ باوجود اس نوعمری کے سب سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ میں نے اپنے اس عریضہ میں بار بار اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا ہے مگر میرے پاس چالیس روز گذار کر بھی میں آپ کے بارے میں یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ آپ کو خدا پر یقین ہے بھی یا نہیں! زبان سے تو اقرار ضرور ہے مگر بعض اوقات بے اختیار زبان سے کوئی ایسی بات نکل جاتی ہے کہ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ؎

جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمین سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

پیارے شمیم! ''آئینہ'' سرینگر سے نکلتا ہے اور دھوم اس کی پاکستان میں ہے۔ لوگ سائیکلوں پر، ٹانگوں پر اور ٹیکسیوں پر دوڑتے ہوئے آتے ہیں کہ ہمیں بھی ''آئینہ'' دکھایئے۔

آپ نے اپنے سفرنامے میں میرے متعلق یہ لکھا ہے کہ میں سیاست سے دل برداشتہ ہو گیا ہوں۔ یہ غلط ہے سیاست سے نہیں، لیکن سیاسی لیڈروں سے ضرور دل برداشتہ ہو گیا ہوں۔ میں آپ جیسے سیاستدانوں سے دور رہنا چاہتا ہوں، جو اس وقت بھی احمقوں کی جنت میں رہ کر کشمیر کے متعلق سبز باغ دکھاتے رہتے ہیں۔ میرے ایک سوال کا جواب دیجیے۔

میں اپنی مرضی کے خلاف اپنے وطن سے بے وطن کر دیا گیا ہوں۔ مجھے ابھی تک اپنے جرم کے متعلق کچھ نہیں معلوم، ستر سال کی عمر ہو چکی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مجھے اپنے وطن کی مٹی بھی نصیب نہیں ہو گی۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مجھے یرغمال کے طور پر یہاں بھیجا کیوں گیا اور جن لوگوں نے مجھے یہاں بلوالیا ان پر کیا میری اور میرے اہل وعیال کی کفالت کی ذمہ داری نہ تھی؟ میں آپ کی حکومت کو ظالم اور یہاں کی حکومت کو بے انصاف نہ کہوں تو کیا کہوں؟ اسی لیے کہتا ہوں کہ ظلم اور ناانصافی کے اس ماحول میں مسئلہ کشمیر کا کوئی حل ممکن نہیں۔ اس کو نہ آپ حل کر سکتے ہیں نہ شیخ صاحب اور نہ کوئی اور، باقی رہا کنونشن، بیانات، تقریریں اور وعدے یہ تمام سیاسی ہتھکنڈے ہیں جو آپ لوگ عوام کو گمراہ کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

والسلام

خاکسار

ایم اے صابر

راولپنڈی پاکستان

مائی ڈیر شمیم صاحب، سلمہٗ اللہ تعالیٰ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

اُمید ہے کہ آپ معہ اہل خانہ واحباب کے خیریت سے ہوں گے۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نے پاکستان میں چالیس دن کے سلسلے میں اپنے اخبار ''آئینہ'' میں

بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ مجھے ایک اخبار بھی نہیں ملا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو صحیح ایڈرس کا علم نہیں ہوگا۔ مجھے خواجہ محی الدین صاحب رہبرؔ کا اخبار ''رہبر'' اور عزیز کاشمیری صاحب کا اخبار ''روشنی'' کا ایک ایک شمارہ ملا ہے ان کا بہت بہت شکریہ۔ براہ کرم مجھے اپنا اخبار معہ گذشتہ تمام شماروں کے ارسال کریں، جن میں آپ نے پاکستان میں چالیس یوم کے متعلق لکھا ہے۔ میری طرف سے شیخ صاحب، بیگ صاحب، مسعودی صاحب، صدر الدین صاحب مجاہدؔ، بزاز صاحب اور دیگر تمام دوستوں کو سلام کہہ دیں۔ راستہ کھلانے کے لیے جدوجہد کریں۔ اس وقت وطن کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ نہ معلوم آپ کو میرا خط ملے گا یا نہیں، جواب سے مطلع فرمائیں۔ والسلام

خاکسار احقر العباد

راولپنڈی　　　　غلام نبی گلکار

مکرمی شمیم صاحب! السلام علیکم۔ اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ بہت مرحلے طے کرکے آپ کے چند ایک پرچے موصول ہوئے۔ دل کرتا ہے کہ بہت کچھ لکھوں، خطرہ ہے کہ یہاں یا وہاں میری محنت رائیگاں ہوگی۔ آپ کے ایک اور صحافی بھائی نے تاریخ کشمیر کی ایک جلد شائع کی ہے۔ دوسری مرتب کر رہے ہیں۔ مجھ سے معلومات اور واقعات مطلوب ہیں۔ خصوصاً ۱۹۳۶ء سے ۱۹۷۴ء تک میری زندگی کا یہ دور واقعی میری نظر میں بہت اہم ہے۔ اے کاش! میں ان کی خواہش پوری کرسکتا۔ واقف کار ہی اس پر روشنی ڈال سکتا ہے۔ میں خود بھی ان کے خط کا الگ جواب دوں گا۔ اُمید ہے کہ آپ بھی ذکر کرکے مشکور کریں گے۔ گرمیاں بڑھ رہی ہیں۔ ان دنوں ہم سب مسافر الوطنوں کو وطن کی یاد زیادہ ستاتی ہے۔ وطن عزیز کو ان

آنکھوں سے دیکھنے والوں کی فہرست میں ہمیں بھی شامل کرے، ہمیں خوشی ہوگی۔ ہم نے اپنوں اور اغیار کے لاکھوں طعنے برداشت کیے ہیں۔ نوحہ ضرور کرتے ہیں، تاہم زیادہ تر صبر سے کام لیتے ہیں۔ بزرگوں اور دوستوں کو عرض وسلام۔

خیراندیش

قریشی محمد یوسف

عیدگاہ، راولپنڈی

مکرمی شمیم صاحب!

السلام علیکم! آپ نے مجھ پر بڑی مہربانی کی جب آپ اپنے دورۂ پاکستان کے دوران میرے پاس چند منٹ کے لیے تشریف لائے۔ اس کا آپ نے اپنے اخبار میں بھی ذکر فرمایا ہے۔ جیسا کہ آپ نے خود بھی اخبار میں لکھا ہے کہ آپ کے والدِ مرحوم محمد یعقوب صاحب میرے خاص دوست تھے۔

لیکن میرے متعلق جو انکشافات آپ نے اسی مضمون مورخہ ۱۷ مئی ۶۹ء میں صفحہ ۶ پر فرمائے ہیں، وہ میرے لیے حیران کن ہیں۔ میں نے پہلی دفعہ اپنے بارے میں آپ ہی کے اخبار میں پڑھا ہے کہ میرے سر کی قیمت دس ہزار روپے رکھی گئی تھی۔ دوسری بات جو آپ نے لکھی ہے کہ میرے پاکستان کے اعلیٰ سول اور فوجی حکام سے تعلقات ہیں، یہ بھی بے بنیاد ہے۔ پاکستان کے اعلیٰ فوجی وسول حکام کی تصویریں میں نے اخبارات اور ٹیلی ویژن میں ہی دیکھی ہیں۔ ان سے کسی رابطہ کا شرف اب تک حاصل نہیں ہوا۔ جیسا کہ آپ نے خود ملاحظہ کیا، میں گوشۂ تنہائی میں زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں اور کسی سیاسی پارٹی یا مسئلہ میں دخل دینے سے محترز ہوں۔ مہربانی کر کے یہ سطور اپنے اخبار میں شائع فرمائیں تاکہ میرے احباب اور متعلقین کی غلط فہمی

رفع ہو سکے۔ اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

آپ کا مخلص

پونچھ ہاؤس راولپنڈی — میر مقبول شاہ گیلانی

مکرمی و محترمی شمیم احمد شمیم صاحب!

سلام مسنون! پاکستان سے واپسی پر آپ نے ''آئینہ'' میں ''پاکستان میں چالیس دن'' کے عنوان سے اپنے تاثرات لکھنے کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے، خاصا دلچسپ ہے۔ میں آپ کے اس سلسلہ مضامین کو بغور اور دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ آپ نے یہاں قیام کے دوران جو تاثرات لیے ہیں، ان سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں ہوسکتا ہے کہ آپ نے جو دیکھا، سنا اور تاثر لیا، وہ بے لاگ طور پر بیان کیا ہے۔

اس وقت ''آئینہ'' ۷/اپریل ۱۹۶۹ء) میرے سامنے ہے، اس میں آپ کا مخصوص کالم تیسرا صفحہ میرے زیر نظر ہے، جس میں حسب ذیل عبارت درج ہے:

''آزاد کشمیر اور پاکستان میں مقیم کشمیریوں کی اکثریت ایک آزاد اور خود مختار کشمیر کی حامی ہے۔ پاکستان میں اپنی زندگی کے بیس بیس سال گذارنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پاکستان خوابوں کی وہ جنت نہیں، جس کی تلاش میں وہ اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں گئے تھے۔ پاکستان سے ان کو جو امیدیں، جو توقعات اور جو آرزوئیں وابستہ تھیں۔ گذشتہ بیس بائیس برسوں میں وہ پوری تو نہیں ہوسکیں، لیکن ان پر بڑھاپا چھا گیا اور اب یہ لوگ ایک آزاد اور خود مختار کشمیر کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ لوگ پاکستان سے دل برداشتہ ہونے کے باوجود ہندوستان کے ساتھ الحاق کے بارے میں نہیں سوچ سکتے۔ اس لیے انہیں نجات کا

صرف ایک راستہ نظر آتا ہے وہ ہے خودمختار کشمیر!

آزاد اور خودمختار کشمیر کے حامیوں کو پاکستانی حکومت اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔ پاکستانی حکمرانوں کے خیال میں آزاد کشمیر کا مطالبہ بالواسطہ طور پر پاکستان کے خلاف عدم اعتماد کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے کئی سال کے دوران آزاد کشمیر تحریک کے کئی سرگرم کارکنوں کو گرفتار کر کے کئی کئی ماہ نظر بند رکھا گیا"۔

مجھے افسوس ہے کہ آپ کا یہ تاثر کہ آزاد کشمیر اور پاکستان میں مقیم کشمیریوں کی اکثریت ایک آزاد اور خودمختار کشمیر کی حامی ہے، خلاف واقعہ، بے حقیقت اور بے بنیاد ہے۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ اس لحاظ سے آپ یہ تاثر قبول کرنے میں حق بجانب ہیں کہ آپ پاکستان میں قیام کے دوران جن چند درجن کشمیریوں سے ملے، اُن میں آپ کے رشتہ داروں سمیت غالب اکثریت اُن لوگوں کی ہے جو (زبان سے نہ سہی) دل سے خودمختار کشمیر کے حامی ہیں، لیکن آپ کو یہ ماننا پڑے گا کہ آپ یہاں کے ۲۰ /لاکھ کشمیریوں میں صرف چند درجن افراد سے ملے اور اُن سے باہر خودمختار کشمیر کا کوئی حامی نہیں ہے۔ اس لیے اپنے ملنے والوں کی اکثریت کو یہاں مقیم کشمیریوں کی اکثریت قرار دینا بعید از حقیقت ہے، اس طرح آپ کا یہ دعویٰ بھی درست نہیں ہے کہ:

"خودمختار کشمیر کی تحریک پاکستان میں مقیم کشمیریوں اور اہالیانِ آزاد کشمیر میں اب مقبول اور ہمہ گیر بن گئی ہے"۔

اس سلسلے میں یہی عرض کر سکتا ہوں کہ جن، غلام نبی گلکار صاحب کو آپ نے اس تحریک کا بہت بڑا لیڈر قرار دیا ہے۔ اُنھوں نے جب ۱۹۶۱ء میں آزاد کشمیر کا صدارتی انتخاب اسی سوال پر لڑا تو انہیں چوبیس سو ووٹوں میں سے صرف ۲۹ ووٹ ملے تھے، جن میں اُن کے اپنے فرقے کے درجن بھر ووٹ شامل تھے۔

آپ کی یہ اطلاع کہ خودمختار کشمیر کے حامیوں سے حکومت پاکستان اچھا سلوک نہیں کرتی، سوفیصدی غلط ہے۔ یہاں حکومت پاکستان کی طرف سے کشمیریوں کی جو مراعات حاصل ہیں یا رہی ہیں اُن کو حاصل کرنے میں خودمختار کشمیر کے حامی یہ چند درجن افراد پیش پیش ہیں۔ خود آپ کے رشتہ دار حکومت کی ان مراعات سے لاکھوں روپے کے مالک ہیں۔ سیاسی وظائف، درآمدی لائیسنوں، تجارتی قرضے، الاٹ منٹس اور اس قسم کی دیگر مراعات سے خودمختار کشمیر کے حامی اپنے تناسب سے کئی سوگنا زیادہ مستفید ہورہے ہیں۔ آپ کی یہ اطلاع بھی غلط ہے کہ یہاں خودمختار کشمیر کی حمایت کی وجہ سے کسی شخص کو کبھی نظر بند رکھا گیا ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ آپ نے اپنے ملنے والے چند درجن کشمیریوں کی رائے کو یہاں مقیم ۲۰ لاکھ کشمیریوں کی اکثریت کی رائے قرار دے کر ہمیں اپنے ہم وطنوں کے سامنے غلط رنگ میں پیش کیا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے سراسر برعکس ہے۔

یہاں مقیم کشمیریوں کا سوادِ اعظم اب بھی پاکستان کو ہی اپنی آرزوؤں اور امیدوں کا مرکز سمجھتا ہے اور انہیں نظریہ پاکستان پر دل و جان سے ایمان ہے اور یہاں جو چند درجن افراد خودمختار کشمیر کے حامی ہیں، اُن کو پاکستان کی حکومت اور قوم کے سوادِ اعظم نے اپنے نظریات کے اظہار کی کھلی آزادی دے رکھی ہے اور اُنہیں نظریۂ پاکستان کے حامیوں کے برابر (تناسب تعداد کے لحاظ سے بہت زیادہ) مراعات حاصل ہیں۔

میرا یہ خط ''آئینہ'' کی کسی قریبی اشاعت میں من وعن شائع کر کے مشکور فرمائیں، تاکہ تصویر کا دوسرا رخ بھی سامنے آئے۔ اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

آپ کا مخلص

عبدالصمد وانی، ایڈیٹر ''کشمیر''

راولپنڈی (پاکستان)

محترم شمیم صاحب!

میں آپ کا مشکور ہوں کہ اپنے سفرنامے میں، آپ نے بر سبیل تذکرہ، میرا نام بھی لیا ہے اور ایک جگہ آپ نے لکھا ہے کہ "پاکستان میں مقیم اکثر کشمیریوں نے مجھ سے یہ کہا کہ میر عبدالعزیز اپنے مخالفوں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے بہت نیچی سطح تک آجاتا ہے" پاکستان میں تقریباً ۷ لاکھ اور آزاد کشمیر میں ۱۲/ لاکھ کے قریب کشمیری مہاجر آباد ہیں۔ ان ۱۹/ لاکھ میں آپ سے زیادہ سے زیادہ ایک سو کشمیریوں سے ملے ہوں گے اور ان میں مولوی عبدالغفار ڈار کے قماش کے لوگ بھی شامل ہیں۔

میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میری تنقید ہمیشہ بے لاگ ہوتی ہے اور یہ کہ میں کبھی مقررہ حدود سے تجاوز نہیں کرتا، لیکن میری کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ میری تنقید معروضی اور واقعاتی ہو اور الفاظ کے انتخاب کے سلسلے میں، میں بہت محتاط رہتا ہوں۔ مگر ایسے بھی مواقع آجاتے ہیں کہ جب رمز و کنایات میں بات کرنے کی بجائے کھل کر...... بہت کھل کر...... بات کرنا پڑتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اکثر سیاسی شعبدہ باز اور جعل ساز مجھ سے ناراض بلکہ بیزار ہیں۔ اکرام اللہ جسوال اور مولوی عبدالغفار کا شمار ایسے ہی شعبدہ بازوں میں ہوتا ہے اور ان کی مجھ سے ناراضگی یا برہمی بجا ہے بے جا نہیں۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ گذشتہ ایک برس میں، میں نے اس قسم کے سیاسی جعلسازوں کو بے نقاب کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ میرے بارے میں آپ کو بدظن کرنے کا کام اکرام اللہ جسوال اور مولوی عبدالغفار نے کیا ہوگا۔ جہاں تک جسوال صاحب کا تعلق ہے وہ تقسیم سے قبل فوج میں حوالدار تھے اور وہ واحد ریاستی مسلمان ہیں، جنہوں نے تقسیم کے بعد ہندوستانی فوج میں رہنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ یہ الگ

سوال ہے کہ انکی اس خواہش کو ہندوستان نے قبول نہیں کیا اور انہیں پاکستان آنا پڑا۔ایک مسلمان ہوتے ہوئے اُنہوں نے پاکستانی فوج کی بجائے ہندوستان میں رہنے کی خواہش کیوں ظاہر کی، یہ ایک کہانی ہے، جس کا چرچا یہاں کے اخبارات میں ہوا ہے۔

مولوی عبدالغفار ڈار کے متعلق صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ انہوں نے سرینگر میں اپنی مفروضہ ''شہری جائیداد'' کے فرضی کلیم داخل کر کے پاکستانی حکومت سے بڑی جائیداد حاصل کر لی ہے۔اُنہوں نے جماعت احمدیہ کے اخبار ''اصلاح'' کے دفتر (جو ایک ہندو کی جائیداد ہے) کو اپنی ذاتی جائیداد جتا کر اس کے بدلے تیس ہزار روپے کا معاوضہ حاصل کیا۔اس قسم کے فراڈ کرنے والے میر عبدالعزیز کے مخالف نہ ہوں گے تو کیا اس کی حمایت کریں گے۔یہی وہ لوگ ہیں جو کشمیر کے مسئلے کا کوئی حل نہیں چاہتے، تاکہ ان کے فریب اور ان کے جعل کا پردہ نہ اٹھنے پائے۔اگر ''اکثریت'' سے آپ کی مراد اس قسم کے لوگوں سے ہے تو مجھے بڑی خوشی ہے، لیکن آپ اپنے اخبار میں اکثریت کی تعریف یوں کیجیے کہ ''وہ لوگ جو مجھ سے ملے''۔فقط

آپ کا صادق

میر عبدالعزیز ایڈیٹر ''انصاف''

راولپنڈی

پیارے شمیم!

آج کی ڈاک سے آپ کا اخبار ملا، ''پاکستان میں چالیس دن'' اور ''فیض کے ساتھ ایک شام'' کے مضامین دلچسپی کے ساتھ پڑھے۔بہتر ہوتا کہ آپ تاریخ ملاقات اور دیگر تفاصیل بھی دیتے۔اس سے پڑھنے والوں کی جستجو کم ہو جاتی ہے۔

مولوی محمد عبداللہ میر واعظ کے دونوں شعر بہت پُر افکار تھے۔ دراصل ہر زمانہ میں اہل علم و دانش کو گردوں سے شکایت رہی ہے کہ وہ ناقصوں کو فیض پہنچاتا ہے۔ حافظ شیرازی نے سینکڑوں سال پہلے فرمایا تھا۔

اسپ تازی مجروح شدہ اندزیر پالاں　　　طواق زرہن درگر دن خرے بینم

میرے فاضل اجل والد سردار امر سنگھ صاحب منصور نے ہندی کے ایک دوہا میں فرمایا تھا۔

زِتن　لو　سکھ　جگت　میں　　دکھ　　بھوگیں　　گنوان

آپ کے مضامین میں کئی دلچسپیاں ایسی ہیں جنہیں زیادہ سے زیادہ عوام کے سامنے لانا چاہیے۔ خصوصاً انڈو پاکستان جنگ کے متعلق پاکستانیوں کے تاثرات اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے خیالات۔ فیض نے صدر ایوب کے خلاف بغاوت کی ایک وجہ یہ بیان کی ہے کہ وہ دوسروں کی نہیں سنتے تھے۔ دیکھیں جنرل یحییٰ خان ان کے تجربہ سے کیا فیض پاتے ہیں۔

خیر اندیش جنگ بہادر سنگھ

دہلی　　　　ایڈیٹر ''شیر'' پنجاب.

بھٹو کا مقدمہ

عدالتوں کو انتقام گیری کا ذریعہ بنانے کی تازہ ترین مثال

غداری کے الزام میں چلائے جا رہے مقدمے میں مولانا آزاد نے اپنا دفاع کرتے ہوئے کہا تھا۔تواریخ عالم میں میدان جنگ میں کی جانے والی بے انصافیوں کے بعد عدالتوں میں کی جانے والی بے انصافیوں کا ذکر آتا ہے عدالتوں نے ظلم وستم توڑنے والوں کے ہاتھوں میں ایک انتہائی آسان اور بے ضرر دکھائی دینے والا ہتھیار سونپ دیا ہے۔

ماضی میں عدالتوں کو بدلہ لینے اور سیاسی انتقام گیری کا ایک ذریعہ بنایا گیا ہے اور اس قسم کی تازہ ترین مثال پاکستان کے سابق وزیر اعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف چلایا گیا مقدمہ اور ان کو دی گئی سزائے موت ہے۔

اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ کسی جرم کے لیے مروجہ قانون کے تحت سزا دینا اور انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا کسی ملک کا اندرونی مسئلہ ہے کہ جس میں کسی اور ملک کو مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔

لیکن آج کے مہذب سماج میں اس کا یہ مطلب نہیں لیا جانا چاہیے کہ ظلم ناانصافی وبا اور تشدد کے واقعات پر یہ کہہ کر خاموشی برتی جائے کہ یہ فلاں ملک کا اندرونی مسئلہ ہے اور ان سے نپٹنا اُس ملک کا دردسر ہے اگر ایسا ہوتا تو پھر ہمیں جنوبی افریقہ میں ہو رہے نسلی امتیاز یا سوویت روس میں سیاسی مخالفوں سے ہو رہے

سلوک کے خلاف آواز اٹھانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

کسی ملک کی حکومت دوسرے ملک میں ہو رہے ظلم وستم کے خلاف آواز اٹھانے سے اس لیے گریز کر سکتی ہے کہ اس سے باہمی دوستانہ تعلقات کو زک پہونچ جانے کا اندیشہ لاحق ہے لیکن کسی بھی جمہوری مملکت کو اس بات کا کوئی حق نہیں کہ وہ اپنے شہریوں کو دنیا کے کسی بھی حصے میں ہو رہے ظلم وستم کے خلاف آواز اٹھانے سے اس لیے روک لے............اگر انصاف کے نام پر ناانصافی کی جاتی ہے قانون کے نام پر قانون کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں۔ ہمیں خاموش تماشائی کی طرح رہنا زیب نہیں دیتا۔ اگر ہم اپنے قریبی ہمسایہ ملک میں ہو رہے واقعات کے خلاف آواز بلند نہ کریں تو پھر ہمیں اس بات کا کوئی اخلاقی حق حاصل نہیں کہ ہم دور کے ممالک میں ہونے والے ایسے ہی واقعات کے خلاف احتجاج کریں۔

بنگلہ دیش کے مرحوم شیخ مجیب الرحمان اور مسٹر بھٹو کی کہانی میں کافی مماثلت اور ہم آہنگی ہے۔ ۱۹۷۱ء میں ہم نے شیخ مجیب الرحمان کے ساتھ پاکستان کی حکومت کے سلوک کو وہاں کا اندرونی مسئلہ نہیں سمجھا، بلکہ اپنے خیالات کو برملا طور ظاہر کیا۔ جب ہم نے اس سازش کی بو سونگھی کہ بنگ بندھو کو جیل کی تاریک کوٹھری میں قتل کرنے کی سازش کی جارہی ہے تو ہم نے پاکستان حکومت کو اس سلسلے میں اپنے خیالات سے آگاہ کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کی۔

میرے خیال میں ہندوستان کی حکومت اور عوام مسٹر بھٹو کے مستقبل کے بارے میں ایک عجیب قسم کی شدید عدم توجہی کا رویہ اختیار کئے ہیں مجھے اس بات پر پورا یقین ہے کہ عدم توجہی نہ صرف ہماری روایات کے بالکل برعکس ہے بلکہ اس بات کی بھی مظہر ہے کہ اس نازک اور امتحان کی گھڑی میں ہم پاکستان کے عوام کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں کیا یہ ممکن ہے کہ ہماری اس عدم توجہی کی

وجہ مسٹر بھٹو کے بارے میں ہماری مخالفانہ سوچ ہو اور ہم اندرونی طور اس افسوسناک صورتحال سے محظوظ ہو رہے ہیں کہ جس کا سامنا اس وقت مسٹر بھٹو کر رہے ہیں۔ ذاتی نوعیت کا ایسا رد عمل قابلِ سمجھ تو ہے لیکن ہمیں اس ردعمل کو اپنے پر حاوی ہونے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ ہمیں خود کو ذاتی عناد یا ''وہ اس کا مسئلہ ہے'' کے جذبات کی رو میں نہیں بہنا چاہیے، بلکہ ہمیں اخلاقیات کے اصولوں اور انصاف کے تقاضوں کو سمجھنا چاہیے کہ جو تہذیب کی بنیاد ہیں۔

اگر مسٹر بھٹو نے واقعی کوئی قتل کیا ہے تو پھر وہ اس سزا کے مستحق ہیں کہ جو انہیں دی گئی ہے اگر وہ قتل کی سازش میں شریک تھے۔ تب وہ اس سے بھی زیادہ سخت سزا کے حقدار ہیں کیونکہ اس وقت وہ ملک کے وزیر اعظم تھے تب مسٹر بھٹو نہ تو ہماری ہمدردی اور نہ ہی پاکستان کے صدر کے رحم کے مستحق ہیں لیکن اس صورت حال کا معنی خیز پہلو تو یہ سوال ہے کہ:

> آیا اس بات کو مکمل طور ثابت کیا گیا ہے کہ مسٹر بھٹو نے اپنے سیاسی مخالف احمد رضا قصوری کو قتل کرنے کا پلان بنالیا تھا کہ جس پر عملدر آمد کرتے وقت مسٹر قصوری کے والد، نواب محمد احمد خان مارے گئے! مسٹر بھٹو کے خلاف چلایا گیا مقدمہ غیر جانبدار تھا کیا اس میں تعزیرات اور ضابطہ فوجداری کے قواعد و ضوابط کی مکمل پابندی کی گئی یا پھر اس مقدمے میں ان کے سیاسی مخالفوں نے اُن سے چھٹکارا پانے کے لیے دھاندلیاں کیں؟

اس قسم کے سوالات نہ صرف مسٹر بھٹو کے حامیوں بلکہ دنیا بھر کے لوگوں کے ذہن میں کلبلا رہے ہیں کئی ممالک جو پاکستان اور فوجی حکمرانوں کے دوست ہیں

مسٹر بھٹو کی جان بچانے کے لیے جنرل ضیاء پر ''دوستانہ دباؤ'' ڈال رہے ہیں اس کیس کی سچی اور مکمل نوعیت کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس سیاسی پس منظر اور قانونی کاروائی کے مشکوک پہلوؤں کا جائزہ لینا چاہیے۔

پاکستان کی افواج کے کمانڈر انچیف جنرل ضیاء الحق نے جس صورت حال میں مسٹر بھٹو کا تختہ اُلٹ دیا وہ قابل ذکر ہے مارچ ۷۷ء کے انتخاب میں مخالف جماعتوں کے متحدہ محاذ نے مسٹر بھٹو کی پیپلز پارٹی کی طرف سے کی گئی دھاندلیوں اور بدعنوانیوں کے خلاف احتجاج کیا۔ اس احتجاج نے ایک سنجیدہ صورت حال کو جنم دیا اور وزارتِ اعظمیٰ سے مسٹر بھٹو کے استعفیٰ کا مطالبہ زور پکڑنے لگا۔ مسٹر بھٹو کی اخلاقی اور قانونی پوزیشن غیر محفوظ بن گئی اور انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ چند جگہوں پر بدعنوانیاں ہوئی ہوں گی۔ نتائج برآمد ہونے کے بعد مظاہروں میں ۲۰۰ سے زائد لوگ مارے گئے مخالف جماعتیں مسٹر بھٹو کے استعفیٰ اور نئے انتخابات سے کم کوئی شرط، ماننے کو تیار نہ تھے۔ مسٹر بھٹو نے ہتھیار چھوڑ دیئے اور نئے انتخابات کروانے پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن اس سے قبل کہ مسٹر بھٹو اور مخالف جماعتوں میں حتمی فیصلہ ہو جاتا ہے، جنرل ضیاء نازل ہو گئے اور انہوں نے مسٹر بھٹو اور مخالف لیڈروں کو حفاظتی حراست میں لے کر ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔

اُس وقت مسٹر بھٹو کی عوامی مقبولیت کچھ نہ ہونے کے برابر تھی۔ اپوزیشن کو اس کا بھرپور احساس تھا کہ ایک بار اقتدار مسٹر بھٹو کے ہاتھوں سے چلا گیا ان کی سیاسی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ جنرل ضیاء نے بہت پہلے اس بات کو سمجھ لیا اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے شروع شروع میں مکمل غیر جانبداری کا مظاہرہ کر کے یہ تاثر دینا چاہا کہ وہ سیاسی تنازعوں سے بالا ہیں۔ اپوزیشن نے فوج کے زیر نگرانی انتخابات کا

مطالبہ کیا۔ یہ سوچ کر کہ وہ مسٹر بھٹو اور اُن کی پیوپلیز پارٹی کو ذلت آمیز شکست دے گی۔

جنرل ضیاء نے بھی تین ماہ کے اندر اندر انتخابات کروانے کا اعلان کر کے اقتدار کے لیے اپوزیشن کی بھوک میں شدت پیدا کر لی۔ قومی اتحاد اور جنرل ضیاء دونوں کو اس بات کا یقین تھا کہ ملک کی موجودہ صورت حال میں مسٹر بھٹو کے پھر سے برسر اقتدار آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جنرل ضیاء نے یہ بات محسوس کی کہ وہ ایک ایسے شخص کے تئیں کہ جو سیاسی طور مر چکا ہے، کس طرح سے اپنی شرافت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ ۱۴؍ جولائی کو انہوں نے کہا ''مسٹر بھٹو ایک عظیم سیاست دان ہیں وہ لڑنا جانتے ہیں انہیں تاریخ پر مکمل عبور ہے اور وہ ایک کہنہ مشق انسان ہیں۔

انہوں نے مسٹر بھٹو کو انتخابات میں دھاندلیاں کرنے کی ذمہ داری سے بری کر دیا۔ یو پی آئی کے ساتھ ایک انٹرویو میں جنرل ضیاء نے کہا کہ اگرچہ فوج کے پاس اس بات کی مصدقہ شہادت موجود ہے کہ انتخابات میں بڑے پیمانے پر دھاندلیاں ہوئی تھیں، اس کے پاس ایسی کوئی شہادت نہیں کہ جو مسٹر بھٹو کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا سکے۔ انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ مسٹر بھٹو کسی بھی حالت میں الیکشن جیت جاتے۔ قومی اتحاد کے لیڈروں کو اپنی فتح کے بارے میں اس قدر یقین تھا کہ مارشل لاء کے گھٹن آمیز ماحول کے باوجود انہوں نے فوری انتخابات کا مطالبہ شروع کیا۔

اپنی سیاسی ذہانت کے بارے میں پر اعتماد جنرل ضیاء نے ۱۵؍ اگست کو اعلان کیا فوجی حکومت کسی تحقیقاتی عمل میں خود کو ملوث نہیں کرے گی، چاہے کسی سیاستدان کے خلاف سو فیصد ثبوت ہی کیوں نہ ہو۔ یہ کام حکومت اور قانون

سازیہ کا ہوگا کہ وہ سابقہ حکومت کی کسی بے ضابطگی کی تحقیقات کروائے قومی اتحاد کے سربراہ مولانا مفتی محمود نے مسٹر بھٹو کے پھر سے برسر اقتدار آنے کو خارج از امکان قرار دیا۔ انہوں نے کہا پاکستانی سیاست کا اصول یہ ہے کہ ایک بار کوئی اقتدار سے محروم ہوگیا، ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ ۲۸/ جولائی کو مسٹر بھٹو کو حفاظتی حراست سے رہا کیا گیا اور ملک کی سیاسی صورت حال میں ایک ڈرامائی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ تین ہفتوں کی قلیل مدت میں مسٹر بھٹو کے خلاف ناراضگی اور نفرت کے اُس جذبے کو جس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لیا تھا کی شدت میں فوری طور سے کمی آگئی اور پھر ہوا ان کے موافق چلنے لگی۔ ناراضگی خیر سگالی میں بدل گئی، نفرت ہمدردی میں اور مذمت عقیدت میں، اپنی رہائی کے بعد مسٹر بھٹو جہاں کہیں بھی گئے، اُن کا ایک فاتح ہیرو کی طرح استقبال کیا گیا۔ صورتحال میں اس غیر توقع اور اچانک تبدیلی سے جنرل ضیاء اور قومی اتحاد کو کافی مایوسی ہوئی اور انہوں نے بھٹو لہر کو فنا کرنے کے لیے سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا۔ رہائی کے ایک ہفتہ بعد ۸/ اگست کو لاہور میں بھٹو کے خلاف مظاہروں کا اہتمام کیا گیا لیکن مسٹر بھٹو کے حامیوں نے مخالفوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ ایک سو سے زائد لوگ مارے گئے۔ مارشل لاء انتظامیہ نے مسٹر بھٹو کی نقل و حرکت پر شدید پابندیاں عاید کیں۔ اس کے باوجود راولپنڈی اور کراچی میں مسٹر بھٹو کا شاہانہ استقبال کیا گیا۔ جنرل ضیاء اور قومی اتحاد اس نتیجے پر پہنچے کہ جمہوری طریقے سے مسٹر بھٹو کے پھر سے برسر اقتدار آنے کے خطرے کو ختم کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ انہیں انتخابی میدان سے باہر رکھا جائے۔

اس سلسلے میں جماعت اسلامی کے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک رسمی مطالبہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ مسٹر بھٹو کو انتخاب لڑنے کی اجازت دینا ویسی ہی غلطی ہوگی کہ جو

۱۹۶۹ء میں شیخ مجیب الرحمان کو ایسا کرنے کی اجازت دے کر کی گئی تھی۔ ایک قدامت پسند مسلمان لیڈر کا یہ مطالبہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے مسٹر بھٹو کو سیاسی طور مردہ سمجھ لیا تھا، اب ایک ایسے بھٹو کو دیکھ رہے تھے جو زندگی کی حرارتوں سے بھرپور تھا۔ تحریک استقلال کے ائیر مارشل اصغر خان نے مسٹر بھٹو کی بے ضابطگیوں کی تحقیقات کا مطالبہ کیا اور اس بات پر زور دیا کہ ان الزامات سے بری ہونے کے بعد ہی مسٹر بھٹو کو انتخاب لڑنے کی اجازت دی جائے، مفتی محمود ابھی تک اس زعم میں مبتلا تھے کہ اُن کی جماعت جیت جائے گی۔ ۲۵ راگست کو انہوں نے کہا کہ مسٹر بھٹو کے خاتمے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کو انتخابی میدان میں شکست دی جائے۔ بہرحال قومی اتحاد کی اکثریت نے اس بات کو سمجھ لیا کہ مسٹر بھٹو کے دوبارہ برسر اقتدار آنے کا خطرہ ٹالنے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ ہے انتخاب ملتوی کرنے کا مطالبہ۔ مسٹر بھٹو نے جو زبردست انتخابی مہم شروع کی تھی، اس کا اثر زائل کرنے کے لیے اپوزیشن نے ایک اور طریقہ ڈھونڈا۔ مارشل لاء انتظامیہ کی اعانت سے انہوں نے مسٹر بھٹو کے خلاف مختلف علاقوں کی عدالتوں میں تقریباً ۱۶ کیس دائر کر دیئے اور اس کے ساتھ ہی پیپلز پارٹی کے سرکردہ کارکنوں اور لیڈروں کی گرفتاری شروع کی گئی۔ بالآخر ۳ ستمبر کو مسٹر بھٹو کراچی کی رہائش گاہ سے نواب محمد احمد کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کر کے لاہور پہونچا دیئے گئے۔

مسٹر بھٹو کے خلاف اور مارشل لاء حکومت کے اس بدلتے ہوئے رجحان نے دنیا بھر کے لوگوں کے ذہنوں میں مختلف شکوک پیدا کئے اور پاکستان اکانومسٹ جیسے اخبار نے کہ جو مسٹر بھٹو کا زبردست مخالف سمجھا جاتا تھا، تین ستمبر ۷۷ء کی اشاعت میں لکھا ایک شخص کو جیتنے کا موقع دیئے بغیر لڑنے کے لیے کہنا ایک غیر منصفانہ اور انتہائی غیر منطقی فعل ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ انصاف میں یقین رکھتے ہیں ان کے بیانات اس دعویٰ سے مطابقت نہیں رکھتے ہیں جس کا ایک ثبوت مسٹر بھٹو کے سیاسی مخالفوں کے بُرے عزائم اور مارشل لاء کا بھٹو مخالف رویہ ہے۔

آپ مندرجہ ذیل واقعات کا خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔

جولائی ۷۷ء مارشل لاء کے نِفاذ کے بعد ہی احمد رضا قصوری نے لاہور کے ایڈیشنل سیشن جج کی عدالت میں مسٹر بھٹو اور تین دوسرے افراد کے خلاف مقدمہ چلانے کی ایک درخواست پیش کی، ۱۵/اگست کو لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس ایس رحمان نے اس درخواست کو براہِ راست ہائی کورٹ میں پیش کئے جانے کی اجازت دی۔ یہ درخواست لاہور ہائی کورٹ کے ایک ڈویژن بینچ جو جسٹس کے ایم اے ہمدانی اور جسٹس مظہر الحق پر مشتمل تھا کے روبرو سماعت کے لیے پیش ہوئی۔ ۳/ستمبر کو مسٹر بھٹو کو اس کیس کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا۔ ۴/ستمبر کو مسٹر بھٹو نے جسٹس کے ایم، اے ہمدانی کی عدالت میں درخواست ضمانت پیش کی۔ جو ۱۳/ستمبر کو اُنھوں نے منظور کی۔ اسی روز چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین نے ایک سرکاری پٹشن منظور کی جس کا مقصد اس کیس کو ماتحت عدالت سے ہائی کورٹ منتقل کر کے اس کی براہ راست سماعت کرنا تھا۔ انہوں نے اس کیس کی سماعت کے لیے پانچ ججوں پر مشتمل ایک فل بینچ قائم کیا جس کے سربراہ وہ خود بنے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ فل بینچ میں جسٹس ہمدانی یا نظیر الحق کو شامل نہیں کیا گیا، کہ جو احمد رضا قصوری کی درخواست کی سماعت کر رہے تھے۔

ضمانت پر رہائی کے فوراً بعد مسٹر بھٹو نے اپنی انتخابی مہم پھر سے شروع کی۔ اُن کے مخالفوں نے یہ سمجھ لیا کہ قتل کے الزام میں گرفتار ہونے کے بعد مسٹر بھٹو کی مقبولیت میں کافی فرق آیا ہوگا۔ جب کہ اس برعکس ان کی مقبولیت میں اضافہ

ہو گیا۔ مسٹر بھٹو کے خلاف اُن کے مخالفوں کی ہر کوشش اُن کے حق میں گئی۔ جنرل ضیاء اور مسٹر بھٹو کے سیاسی مخالفین نے سمجھ لیا کہ اب یا تو وہ رہیں گے یا مسٹر بھٹو۔ دونوں کا رہنا ممکن نہیں۔ جنرل ضیا نے غیر جانبداری کا لبادہ اتار پھینکا اور کھلے عام بھٹو مخالف مہم میں شریک ہو گیا۔

جسٹس ہمدانی کا مسٹر بھٹو کو ضمانت پر رہا کرنا اس بات کا مظہر ہے کہ مسٹر بھٹو کے خلاف لگائے گئے بہت سے الزامات بے بنیاد تھے۔ جنرل ضیاء نے کیس کو ایک سول عدالت سے فوجی عدالت میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۷ ستمبر کو مسٹر بھٹو اور پیپلز پارٹی کے دس لیڈر مارشل لاء کے حکم نمبر ۱۲ کے تحت گرفتار کیے گئے۔ جنرل ضیاء نے اعلان کیا کہ ان کے خلاف فوجی عدالت میں مقدمات چلیں گے کہ جن کا فیصلہ ۱۸ اکتوبر سے پہلے سنایا جائے گا (جو کہ انتخابات کے انعقاد کی تاریخ تھی) ایئر مارشل اصغر خان اور بھٹو کے مخالفوں کو تھوڑا بہت اطمینان ہوا کہ فی الحال اس دردسر سے نجات تو ملی اور انہوں نے انتخابات ملتوی کرنے کی تجاویز کی مخالفت شروع کی۔ لیکن وہاں پیر پگاڑو جیسے لوگ بھی موجود تھے جو کہ مسٹر بھٹو کی حراست کے باوجود ان کے سائے تک خوفزدہ تھے اور یہ لوگ انتخابات ملتوی کرنے کے حق میں تھے اور تب کئی یقین دہانیوں کے باوجود جنرل ضیاء نے پولنگ شروع ہونے سے صرف ۱۴ دن قبل انتخابات غیر معین عرصے تک ملتوی کرنے کا اعلان کیا۔ جنرل ضیاء نے کہا "میں انتخابات کے عمل کا بے حد احترام کرتا ہوں لیکن انتخابات کی خاطر میں ملک کو تباہی کا سامنا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا"۔

اس بیان سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ سب سے بڑی تباہی کہ جس کا خطرہ جنرل کو تھا، انتخابات میں بھٹو کی کامیابی اور ان کا اقتدار سنبھالنا تھا اور اس چیز کے نہ ہونے کے لیے ہر چال کھیلی گئی اور جب ہر ایک چال ناکام ہو گئی تو ان کے

لیے بھٹو کو گرفتار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

مسٹر بھٹو کے ساتھ جو کچھ روا رکھا گیا، جو رویہ ان کے تئیں اختیار کیا گیا۔ لوگوں کا ضمیر بیدار کرنے کے لیے کافی ہے اور اگر ہم ایک ایسے شخص کے حق میں آواز بلند کریں کہ جو کبھی ہمارا دشمن تھا تو دنیا ہمیں احترام اور عزت کی نگاہوں سے دیکھے گی۔

لاہور ہائی کورٹ کا فیصلہ اس وقت سپریم کورٹ کے سامنے ہے اور وہاں اس پر کیا فیصلہ سنایا جائے گا، اس کے متعلق کچھ کہنا صحیح نہیں ہوگا لیکن جس طریقے پر اس مقدمے کی کارروائی چلائی گئی جس طریقے سے استغاثے نے اس کیس کو پیش کیا، اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ بھی ہو، مسٹر بھٹو ایک سیاسی جماعت کے سربراہ اور پاکستان کے سابق وزیر اعظم ہیں، ان کے خلاف جو فیصلہ سنایا جاتا ہے اُس پر پاکستانی عوام کو اعتماد ہونا چاہیے اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے پر پاکستانی عوام کا ردعمل اچھا نہیں ہے۔

اس کیس کا سب سے بڑا اور سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اگرچہ قتل کے مقدمات کی سماعت پہلے سیشن عدالت میں کی جاتی ہے لیکن مسٹر بھٹو کے کیس میں بنیادی پہلو نظر انداز کیا گیا اور کیس کی سماعت براہ راست ہائی کورٹ نے کی اس طرح سے مسٹر بھٹو کو ایک بنیادی حق سے محروم کیا گیا۔ یہ ممکن تھا کہ سیشن عدالت انہیں بری کر دیتی۔ یا اگر وہ انہیں مجرم قرار دیتی، تو پھر انہیں ہائی کورٹ میں اپیل کرنے کا حق حاصل تھا۔ مارشل لاء انتظامیہ کے اس عام اور مروجہ طریق کار کو ختم کرنے کے سلسلے میں کوئی صفائی یا وضاحت پیش نہیں کی ہے۔ یہ بات ریکارڈ میں درج ہے کہ مسٹر بھٹو نے مروجہ قانون سے اس غیر معمولی اور اہم نوعیت کے انحراف پر شدید نوعیت کا احتجاج کیا ہے۔ اس کیس کا ایک اہم پہلو چیف جسٹس مولوی

مشتاق حسین کے رول سے تعلق رکھتا ہے۔ انہوں نے اس کیس کی سماعت کے لیے پانچ ججوں پر مشتمل فل بینچ تشکیل دیا۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کرنے کے لائق ہے کہ چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین کو مسٹر بھٹو نے اپنے دور اقتدار میں نظر انداز کیا تھا۔ یہ جنرل ضیاء ہی تھے جنہوں نے مولوی مشتاق کو نہ صرف چیف جسٹس مقرر کرلیا بلکہ انہیں چیف الیکشن کمشنر بھی بنایا۔ پیپلز پارٹی نے مولوی مشتاق کو جانبدار اور اس عہدے کے لیے نا اہل قرار دیا۔ بعد میں سپریم کورٹ میں اپنی پٹشن میں مسٹر بھٹو نے واضح الفاظ میں ان باتوں کو دہرایا کہ انہیں چیف جسٹس سے کسی انصاف کی توقع نہیں۔ انہوں نے چیف جسٹس کی جانبداری کا ذکر کرتے ہوئے ان کے اس حکم کی مثال پیش کی جس کے مطابق انہوں نے اسی روز سیشن عدالت سے قتل کے مقدمے کو ہائی کورٹ میں منتقل کرنے کا حکم جاری کیا تھا، کہ جس روز جسٹس ہمدانی نے انہیں ضمانت پر رہا کیا تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جس وقت مسٹر بھٹو کو ضمانت پر رہا کیا گیا۔ اس وقت تک پولیس نے ملزمان کے خلاف مکمل چالان پیش نہیں کیا تھا۔ آیا چیف جسٹس کی جانبداری کے بارے میں مسٹر بھٹو کا جواب صحیح ہے یا نہیں۔ ان باتوں کا بنیادی اصولوں سے گہرا تعلق ہے۔

آیا مسٹر بھٹو مولوی مشتاق حسین کی چیف جسٹس کی تقرری کے سلسلے میں حق بجانب تھے یا نہیں۔ اس سے بھی ہمیں کوئی غرض نہیں، لیکن یہ بات کافی اہم ہے کہ مقدمہ کی شروعات میں ہی مسٹر بھٹو نے اپنے خدشات کا اظہار کیا تھا اور مقدمے کی کاروائی کے دوران بارہا مسٹر بھٹو اور چیف جسٹس کے درمیان تلخ کلامی ہوئی۔ اور یہ بات صاف ظاہر ہوگئی کہ چیف جسٹس کا مسٹر بھٹو کے تئیں جو رویہ تھا وہ سطحی قسم کا تھا۔ بعد میں مسٹر بھٹو نے عدالت پر جانبداری اور انتقام گیری کا الزام عائد کیا، مقدمے کی سماعت سے بائیکاٹ کیا اور اپنا دفاع کرنے سے انکار

کیا۔ یہ بات کافی اہم ہے کہ جس دوران استغاثہ اپنے گواہ پیش کرتا رہا۔ مقدمے کی سماعت کھلی عدالت میں چلتی رہی اور کاروائی کافی تشہیر کی گئی لیکن جوں ہی مسٹر بھٹو کی طرف سے دفاع کرنے کی کاروائی شروع ہوئی، عدالت کی کاروائی کو بند کمرے میں شروع کرنے کا حکم صادر کیا گیا۔ یہ غیر معمولی نوعیت کا قدم اٹھاتے وقت ہائیکورٹ نے رولنگ دی کہ اپنا دفاع کرنے کی آڑ میں مسٹر بھٹو عدالت کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

مسٹر بھٹو اور چیف جسٹس کے درمیان تعلقات خراب ہونے کی وضاحت کے سلسلے میں، میں صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ انسپکٹر غلام حسین جو کہ ایک وعدہ معاف گواہ تھے، نے کہا کہ جسٹس جمیل حسین رضوی کو قتل کرنے کا ایک منصوبہ بھی بنایا گیا تھا۔ بدقسمتی سے گواہ کی زبان سے جسٹس رضوی کے بجائے چیف جسٹس کا جملہ نکلا۔ چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین نے مسکراتے ہوئے کہا چیف جسٹس نہیں صرف جج کہو۔ چیف جسٹس کی باری ابھی نہیں آئی ہے۔ مسٹر بھٹو نے کافی مدھم لہجے میں کہا کوئی فکر نہیں یہ بھی آئے گی۔ اس فقرے سے چیف جسٹس اس قدر پریشان ہوگئے کہ انہوں نے عدالت میں موجود پولیس سپرانٹنڈنٹ کو حکم دیا کہ وہ یہ فقرہ نوٹ کرے اور قریبی تھانہ میں اس بارے میں رپورٹ درج کروائے۔ تاکہ کسی بھی ناخوشگوار حادثے کے نتیجے میں مجرم کی شناخت میں کوئی دقت نہ ہو۔ ایس۔ پی۔ نے انارکلی پولیس اسٹیشن میں چیف جسٹس کو دی گئی مسٹر بھٹو کی دھمکی کی رپورٹ درج کروائی اور یہ بات یقیناً چیف جسٹس کی بالغ نظری کے حق میں نہیں جاتی۔

ایک موقع پر چیف جسٹس اور مسٹر بھٹو کے درمیان مکالمہ آرائی ہوئی۔ چیف جسٹس نے ناراض ہو کر عدالت میں موجود پولیس افسروں کو حکم دیا کہ وہ مسٹر بھٹو کو

عدالت سے باہر لے جائیں اور تب تک اسے واپس نہ لائیں کہ جب تک وہ اپنی اصلیت پر نہیں آتا۔ مقدمے کی کاروائی کے دوران وہ مسٹر بھٹو سے بے پناہ حقارت اور توہین آمیز طور پیش آئے اور انہیں کم روشنی والی ایک جگہ پر بڑے بھولے بھالے انداز میں کھڑے رہنے پر مجبور کیا۔

فیصلہ سنانے کے عمل میں بھی چیف جسٹس نے ایک انتہائی غیر معمولی اور منفرد طریقہ اختیار کیا۔ فیصلہ محفوظ رکھا جا چکا تھا اور جب کہ طریقہ ہے متعلقہ فریقوں کو فیصلہ سنانے سے قبل اس کی اطلاع دی جانی ضروری ہے تا کہ وہ اس وقت وہاں پر موجود رہ سکیں لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ فیصلہ سنانے سے قبل صرف ایک گھنٹہ مختلف ملزمان کے وکیلوں کو فون پر اطلاع دی گئی مگر اس سے قبل کہ وہ وہاں پہنچ جائیں فیصلہ سنایا جا چکا تھا اور جج صاحبان واپس بھی چلے گئے تھے۔ کیا جج صاحبان اپنے ضمیر کی آواز سے خوفزدہ تھے کیا انہیں صفائی کے وکلاء سے ڈر تھا۔ کیا وہ اس بات سے ڈر رہے تھے کہ فیصلہ سن کر کہیں لوگ مشتعل نہ ہو جائیں۔ فوج کی بھاری جمعیت کی موجودگی بھی ان کو احساس تحفظ نہ دلا سکی۔ مسٹر بھٹو کو دی گئی سزا کی تمام بنیاد مقتول کے فرزند احمد رضا قصوری، ۲ عدد معاف گواہوں اور ۲ ملزمان کے اقبال جرم کے بیانات پر مشتمل ہے۔ فوجداری مقدمات میں ہمیشہ ملزم کو شک کا فائدہ دیا جاتا ہے لیکن مسٹر بھٹو کے مقدمے میں ہر ایک فائل استغاثے کے لیے محفوظ تھا۔

احمد رضا قصوری ایک زمانے میں پیپلز پارٹی کے سرگرم رکن اور بھٹو کے زبردست حلیف تھے۔ وہ ۱۹۷۵ء میں قومی اسمبلی کے لیے منتخب ہو گئے۔ لیکن بہت جلد ان کے اور مسٹر بھٹو کے درمیان سیاسی اختلافات پیدا ہو گئے اور دونوں کے تعلقات میں خرابی آ گئی۔ اس کے نتیجے میں انہوں نے پیوپلز پارٹی سے مستعفی ہو کر تحریک استقلال میں شمولیت اختیار کی۔ حزب اختلاف کے ایک رکن کی

حیثیت سے قصوری بڑی بے رحمی سے مسٹر بھٹو کی نکتہ چینی کرتے رہے اور کئی بار انہوں نے الزام لگایا کہ مسٹر بھٹو انہیں قتل کرنے کی سازش بنارہے ہیں۔ان کے مطابق ۱۰/اور ۱۱/نومبر ۱۹۷۴ء کو انہیں قتل کرنے کی ایک ناکام کوشش کی گئی۔ بعد میں احمد رضا قصوری اور تحریک استقلال کے سربراہ ایئر مارشل نور خان کے درمیان کچھ اختلافات پیدا ہوگئے۔انہوں نے تحریک استقلال سے استعفیٰ دیا اور ۶/اپریل کو دوبارہ پیپلز پارٹی میں شامل ہو کر مسٹر بھٹو کی قیادت پر ایمان لایا اور ۸/اپریل ۱۹۷۷ء تک وہ پیپلز پارٹی سے ہی وابستہ رہے۔

قصوری نے عدالت میں یہ تسلیم کیا کہ مارچ ۷۷ء کی قومی اسمبلی کے انتخابات میں اس نے پیپلز پارٹی کی ٹکٹ کے لیے درخواست دی تھی کہ جسے نامنظور کیا گیا۔اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ ۱۹۷۶ء میں وہ ایک پارلیمانی وفد کے ہمراہ ماسکو گیا تھا اور اپنی رپورٹ میں اس نے لکھا تھا کہ ہم اس بات سے بے پناہ متاثر ہوگئے کہ پوری دنیا میں آپ کی امیج (سر بھو) ایک عالمی سیاستدان کی ہے۔

اس مقدمے میں دو وعدہ معاف گواہ تھے۔فیڈرل سیکورٹی فورس کے ڈائریکٹر جنرل مسٹر مسعود محمود نے اپنے بیان میں کہا کہ مسٹر بھٹو نے انہیں ہدایت دی تھی کہ وہ احمد رضا قصوری کو کسی بھی طریقے پر ختم کریں۔سابق وزیراعظم نے کہا تھا ''اس کا مردہ جسم پیش کیا جائے۔ یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ وعدہ معاف گواہ بغیر کسی لالچ یا مالی فائدے کے یہ بھیانک جرم کرنے پر آمادہ ہوگیا۔اس کے مطابق اس کے ایسا کرنے کی وجہ یہ تھی کہ مسٹر بھٹو نے دوسری صورت میں اس کی بیوی اور بچوں کو ختم کرنے کی دھمکی دی تھی۔ مسعود محمود نے مزید یہ کہا کہ وہ ایف ایس ایف کے ڈائریکٹر جنرل بننے پر آمادہ نہیں تھے بلکہ انہیں مسٹر بھٹو نے یہ عہدہ قبول کرنے کے لیے مجبور کیا تھا اور انکار کی صورت میں انہیں جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی۔

اس کیس کا عجیب وغریب پہلو یہ بھی ہے کہ مسٹر بھٹو کے بغیر تمام ملزمان نے اقبال جرم کیا ہے (بعد میں محمد عباس نامی ایک ملزم نے اپنے اقبال بیان سے منحرف ہو گیا)۔

ہائی کورٹ کے پانچ ججوں کے فل بنچ نے بارہا قرآنی آیات اور حضرت محمد ﷺ کی روایات کو دہرایا۔ لیکن بیشتر علماء کے خیال میں نہ تو مقدمے کی کاروائی شرعی طریقے پر چلائی گئی اور نہ ججوں کا فیصلہ ہی اسلامی اور شریعت کے اصولوں سے میل رکھتا ہے۔

شرعی قانون کے تحت کسی بھی ایسے شخص کو پھانسی نہیں دی جاسکتی ہے جس نے بذات خود قتل نہ کیا ہوا۔ اب اگر گواہوں کے بیانات کو صحیح سمجھا جائے، مسٹر بھٹو نے احمد رضا قصوری کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا، اس کے والد کو نہیں، اس لیے انہیں ایک ایسے جرم کا قصوروار ٹھہرانا جائز نہیں ہے کہ جس کے بارے میں نہ تو انہوں نے سوچا تھا اور نہ کوئی حکم ہی دیا تھا۔ سرکردہ عرب ممالک کے علماء نے اپنے فتوؤں میں یہ بات واضح کی ہے کہ مسٹر بھٹو کے خلاف چلائے گئے مقدمے کی تمام کاروائی اور ان کو دی گئی سزائے موت قرآن اور سنت کے اصولوں کے عین منافی ہے۔

مسٹر بھٹو کو دی گئی سزائے موت نہ صرف انگریزی قوانین کی رُو سے قرین ناانصافی کے مترادف ہے بلکہ شرعی قانون کے لحاظ سے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مہذب دنیا بمعہ مسلم ممالک نے جنرل ضیاء سے اپیل کی ہے کہ وہ ایک احمقانہ فیصلے پر عمل نہ کریں کہ جس کے نتیجے میں مِس بے نظیر بھٹو کے الفاظ میں پاکستان میں خون کے دریا بہہ جائیں گے۔

(''آئینہ'' ۱۱ر مئی ۱۹۷۸ء)

بھٹو کی اہمیت اور عظمت

(آخری مضمون جو عدالت کے سبب مکمل نہیں کیا جا سکا)

بھٹو کو پھانسی دی جائے گی اس کا یقین مجھے ۶ رفروری ۹ ۷ ء کو پاکستان کی سپریم کورٹ کا فیصلہ سننے کے بعد ہی ہوا تھا۔ لیکن سب کچھ جانتے ہوئے بھی میرا دل یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ بھٹو کو پھانسی دی جائے گی۔ ایک طرف پاکستان کے حالات تھے۔ ضیاء الحق کے بیانات تھے۔ پاکستان قومی اتحاد کے لیڈروں کے منصوبے اور ان کی سرگوشیاں تھیں اور بھٹو کو پھانسی کے تختے کی طرف لے جانے کے لیے عدالتوں اور فوجی جنرلوں کی سازشیں تھیں کہ جو موت اور صرف موت کی نشان دہی کر رہی تھیں اور دوسری طرف محض ایک موہوم امید، ایک بے نام سی خواہش اور ایک معصوم سی آرزو تھی کہ جو موت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی بھٹو کی زندگی کا چراغ روشن کیے ہوئے تھی۔ بھٹو کی زندگی کے آخری لمحے کے کچھ لمحوں بعد تک بھی امید اور آرزو کا یہ چراغ ٹمٹماتا رہا۔ میں یہی سوچتا رہا کہ آخری لمحے پر کوئی نہ کوئی ایسا معجزہ رونما ہوگا کہ جس سے بھٹو کی جان بچ جائے گی۔ افسوس! کہ دل کی ساری وکالت دماغ کی عدالت میں بے کار گئی اور وہی ہوا کہ جس کے تصور سے بھی خوف آتا ہے۔ نہ کوئی معجزہ ہوا نہ عین وقت پر کوئی غیر متوقع حادثہ ہوا، نہ قاتل کے ہاتھ سے خنجر چھوٹا اور نہ اس کے دل میں رحم یا انسانیت کی کوئی کرن پھوٹی۔ سقراط کو ایک بار پھر زہر کا پیالہ پلایا گیا۔ عیسیٰ کو ایک بار پھر صلیب پر چڑھا دیا گیا، اور

امام حسین کو ایک بار پھر یزید نے شہید کر دیا۔

جو لوگ بھٹو کو صرف نام سے جانتے تھے وہ ان کا ماتم کر چکے، کسی نے اخباری بیان دے کر، کسی نے چھاتی پیٹ کر، کسی نے گرجا جلا کر، کسی نے مسجد مسمار کر کے اور کسی نے اپنے پڑوسی کا گھر خاکستر کر کے بھٹو کے غم کا قرض ادا کر دیا۔ لیکن میں نے ابھی ذوالفقار علی بھٹو کے قتل پر نہ کوئی بیان دیا ہے اور نہ کسی مظاہرے میں شرکت کی ہے۔ میں اب بھی اس الجھن میں ہوں کہ اتنے بڑے غم، اتنے عظیم سانحے اور اتنی بڑی قیامت کے لیے اظہار کو وہ کون سا اسلوب اور پیمانہ منتخب کروں کہ جو اس درد اس کرب، اس محرومی اور کسک کا احاطہ کر سکے کہ جو ذوالفقار علی نام کے اس خوب رو، خوش پوش، خوش کلام اور خوش اندام شخص کی موت سے وابستہ ہے کہ جسے میں زندگی میں صرف ایک بار ملا ہوں۔ میری نگاہوں میں رہ رہ کر سفید قمیض اور پتلون میں ملبوس، بکھرے بالوں والے، چہرے پر تھکن مگر ہونٹوں پر ایک دل آویز مسکراہٹ سجائے ہوئے اس نوجوان کی شبیہ ابھر آتی ہے کہ جو آج سے ٹھیک دس سال پہلے کراچی میں اپنی شاندار قیام گاہ کے ڈرائنگ روم میں مجھ سے پہلی اور آخری بار ملا تھا۔ میرے لیے یہ تصوّر بھی روح فرسا ہے کہ وہ بانکا، سجیلا اور سج دھج والا نوجوان، جس نے بعد میں صرف پاکستان ہی نہیں ساری دنیا میں اپنی سیاست اور خطابت سے تہلکہ مچا دیا تھا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے موت کی گہری نیند سلا دیا گیا ہے۔ اس کے بغیر یہ دنیا کتنی ویران اور سونی سونی سی لگ رہی ہے۔ جن لوگوں نے بھٹو کو اپنی راہ کا کانٹا سمجھ کر اسے تختہ دار پر لٹکا دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ انہیں بھی ایک کمی، ایک خلا کا سا احساس ہو رہا ہوگا۔ یہی میرے بھٹو کی شانِ دلربائی ہے۔

میں ذوالفقار علی بھٹو سے اپنی ایک ملاقات کی بنیاد پر ان سے کسی قربت نسبت یا وابستگی کا دعویٰ نہیں کر رہا ہوں۔ یہ ملاقات اتنی مختصر رسمی اور خالص سیاسی تھی کہ میرے لیے اس کی اہمیت محض تاریخی ہے۔ لیکن مجھے یہ دعویٰ کرنے کی اجازت دیجیے کہ میں بھٹو سے صرف ان کے نام، ان کے سیاسی رتبے اور مسئلہ کشمیر سے ان کی گہری دلچسپی کے تعلق سے ہی واقف نہیں ہوں۔ میری نظر ان کی بھرپور شخصیت، ان کی بے پناہ ذہانت، ان کی تخلیقی سیاست اور ان کے اس جمالیاتی پیکر پر ہے کہ جس نے ان کے چاہنے والوں کو ان کا عاشق اور ان کے مخالفوں کو ان کی جان کا دشمن بنا دیا تھا۔

وہ محض ایک سیاست دان یا پاکستان کے ایک سابق وزیر اعظم ہی ہوتے تو ان کی شخصیت اور ان کے انجام پر مجھے افسوس ضرور ہوتا، لیکن میرے دل پر وہ گھاؤ، میری روح پر وہ حرف اور میری رگ رگ میں وہ درد نہ ہوتا کہ جس نے میری ہی طرح ایک دنیا کو بے قرار کر دیا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ وہ صرف سیاست دان ہی نہیں، شاعر بھی تھا۔ وزیر اعظم ہی نہیں بلکہ انقلابی بھی تھا۔ ایک رہنما ہی نہیں، ایک مفکر بھی تھا اور یہ سب کچھ ہونے کے علاوہ ایک بڑا ہی خوبصورت اور خوش مزاج نوجوان بھی تھا۔ وہ ہمارے جانے پہچانے آج کل کے روایتی سیاست دانوں کی طرح کھوکھلا، گونگا، روکھا پھیکا، ان پڑھ، تنگ نظر اور ریاکار نہ تھا۔ اس کے سیاسی عقاید اور نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ اس کا اپنا کوئی عقیدہ یا نظریہ نہیں تھا۔ وہ تقریر کرنے پر آتا تو خطابت کے دریا بہاتا، لکھنے پر آتا تو قلم توڑ کے رکھ دیتا۔ وہ بڑا رنگین اور شوقین مزاج آدمی تھا، جسے زندگی کی خوبصورتیوں کا احساس اور اس کی رعنائیوں سے عشق تھا وہ علامہ اقبال کے بعد غالباً مسلمانوں کے پہلے

لیڈر تھے کہ جس کی نظر صرف مشرق تک ہی محدود نہ تھی بلکہ مغرب کی فکر اور نظریات پر بھی حاوی تھی۔ اس کی کتابوں کے مطالعے سے جو بصیرت ملتی ہے وہ پولٹیکل سائنس کی بڑی بڑی کتابوں سے بھی حاصل نہیں ہوسکتی۔ مجھے یاد ہے کہ دس سال قبل اپنی پہلی ملاقات میں نے بھٹو سے جب یہ کہا کہ ہمارے ملک میں آپ کی امیج یہ ہے کہ آپ کی ساری سیاست اور فلسفے کی بنیاد ہندوستان سے نفرت پر مبنی ہے اور آپ کو صرف ہندوستان سے ہی نہیں ہندوؤں سے بھی نفرت ہے، تو بھٹو صاحب نے یہ جواب دیا تھا۔

''جی نہیں'' ایسی کوئی بات نہیں، میں دور جدید کی پیداوار ہوں اور میں فرقہ پرست نہیں ہوں اور پھر ہندوستان سے نفرت کا سوال اس لیے بھی پیدا نہیں ہوتا کہ ہماری تاریخ اور ہمارا جغرافیہ ایک رہا ہے۔ البتہ میں کشمیری عوام کے حق خودارادیت کے سوال پر کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں'' میں نے کہا تھا۔

''بھٹو صاحب پاکستان کی موجودہ سیاسی صورت حال کا ایک مایوس کن پہلو یہ ہے کہ آج بیس بائیس سال بعد بھی یہاں ملاازم کا بڑا زور ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ ملاؤں کے لیے بنا تھا۔ پاکستان کی یہ تصویر یقیناً کسی ترقی پسند اور روشن دماغ انسان کے لیے پرکشش نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ یہاں اسلام اور ملاازم کو تقریباً ہم معنی سمجھا جانے لگا ہے'' تو بھٹو صاحب نے بڑے اعتماد اور یقین بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''یہ ٹھیک ہے لیکن میں آپ کو بتادوں کہ ملاازم یہاں نہیں چل سکے گا۔ اگر ہم عوام کی طاقت کے بھروسے پر ملک میں انقلاب لانے میں کامیاب ہو جائیں تو مُلاازم کا مقابلہ بڑی آسانی کے ساتھ ہوگا۔ میں نہیں کہتا کہ ملاؤں کی

کوئی طاقت نہیں لیکن عوامی طاقت کے مقابلے میں یہ لوگ ٹھہر نہیں سکتے"۔

بھٹو نے یہ بات اس وقت کہی تھی کہ جب ایوب خان کے اقتدار اور اس کی امرت کا طلسم تو ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن ابھی اس نے اس عوامی یلغار کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے تھے کہ جس کی قیادت بھٹو کر رہے تھے لیکن صرف ایک سال کے اندر اندر بھٹو کی پر جوش قیادت اور اس کی دلنواز شخصیت نے ثابت کر دیا کہ پاکستان کے مُلا "عوامی طاقت کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتے"۔ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں ایک طرف پاکستانی ملاؤں کی تمام تر طاقت، ان کا مذہبی جنون، ان کی فرقہ وارانہ سیاست اور ان کا انتہائی شر انگیز پروپیگنڈا تھا اور دوسری طرف بھٹو اور اس کی پیپلز پارٹی، غریب بھٹو کے خلاف وہ سارے ہتھکنڈے استعمال کیئے گئے کہ جو بالعموم تنگ نظر مولوی اور خود غرض سیاست دان ہر روشن دماغ، ترقی پسند اور دور اندیش مسلمان رہنما کے خلاف استعمال کیا کرتے ہیں۔ کہا گیا کہ وہ مسلمان نہیں، اسے نماز پڑھنا نہیں آتی، وہ شراب پیتا ہے۔ وہ اسلام کا دشمن ہے اور کمیونسٹوں کا ایجنٹ۔ پاکستان میں کسی بھی لیڈر کے خلاف اس قسم کا پروپیگنڈا اس کے سیاسی کردار اور مستقبل کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے اور خاص طور پر اس وقت کہ جب ایسا کہنے والے مولوی ہوں اور بزرگان دین۔ لیکن بھٹو عوامی طاقت کے بل بوتے پر بڑی شان سے ان لیڈروں کو پاؤں تلے روندتا ہوا اس طرح آگے بڑھ گیا کہ مولوی صاحبان اپنی پگڑیاں اور جوتے چھوڑ کر میدان سے بھاگ گئے۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک لیڈر نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اس ملک میں ایک جدید تہذیب یافتہ ترقی پسند اور سوشلسٹ سماج تعمیر کیا جا سکتا ہے اور اس موقع پر میں نے پاکستان زندہ باد کے عنوان سے ایک اداریہ سپرد

قلم کر کے بھٹو صاحب کو خراج عقیدت اور ان کی قیادت کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔ ٹھیک ۹ سال بعد راولپنڈی جیل کی ایک کالی کوٹھری میں پاکستان کے مولویوں، ملاؤں، اسلام فروشوں اور مذہب کا کاروبار کرنے والے سوداگروں نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں اپنی شکست کا انتقام لینے کے لیے بھٹو کے گلے میں پھانسی کا پھندا لٹکا کر اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔ بھٹو نے مجھ سے کہا تھا کہ ''پاکستان میں ملاازم نہیں چل سکے گا''۔ بھٹو کے قاتلوں کا خیال ہے کہ بھٹو کے قتل کے بعد پاکستان میں ملاازم کا مستقبل محفوظ ہو گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قاتلوں کے منصوبے پورے ہوتے ہیں یا مقتول کے خواب؟

میرے نزدیک بھٹو کی اہمیت اور عظمت کا راز اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ اس نے پاکستان کو مملکت اور قومیت کا ایک جدید تصور دیا۔ اس نے تعصّبات اور توہمات میں جکڑے ہوئے لوگوں کو ایک نئے اور مثبت اقتصادی اور معاشی نظام سے روشناس کر دیا۔ اس نے روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ دے کر امیری اور غریبی کو خدا کی دین سمجھنے والے لوگوں کو جدوجہد کا حوصلہ دیا۔ اس نے پاکستان کو مولویوں کی قید اور ملاؤں کے چُنگل سے چھڑانے کے لیے عوامی طاقت کے بل بوتے پر ان کے خلاف جہاد کیا اور پاکستان جیسے ملک میں یہ سب کچھ کرنا اتنا آسان نہیں کہ جتنا ہمیں نظر آتا ہے۔ اسے اپنے بنیادی مقصد کے حصول کے لیے بارہا ایسے ایسے سمجھوتے کرنا پڑے کہ جو اس کے ذہن اور ضمیر دونوں کو ناگوار تھے اور بعض اوقات ملاؤں کی یلغار کو روکنے کے لیے خود مولوی بننا پڑا۔ لیکن پاکستان کو ایک جدید ترقی پسند اور طاقتور ملک بنانے کا بنیادی مقصد اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوا۔ اس کی موت کی

سازش دراصل اس بنیادی مقصد کے خلاف سازش تھی اوراس کے قاتلوں کو اس بات کا احساس تھا کہ بھٹو کو قتل کئے بغیر جدید پاکستان کے خواب کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے الفاظ میں بھٹو کا قتل ایک فرد اور ایک ذات کا نہیں، ایک تصور، ایک عقیدے، ایک خواب اور ایک ملک کا قتل ہے۔

میرا یہ دعویٰ نہیں کہ بھٹو میں کوئی کمزوری یا خامی نہ تھی۔ بلکہ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ان میں بہت سی ایسی کمزوریاں اور کوتاہیاں تھیں کہ جن کی وجہ سے وہ اقتدار میں آنے کے بعد بارہا اپنا توازن برقرار نہ رہ سکے۔ اقتدار کے استعمال اور اقدار کے تحفظ دونوں میں انہوں نے بڑی لاپروائیاں برتیں اور خاص طور پر اپنے مخالفوں سے نمٹنے کے لیے انہوں نے کئی بار جمہوری حدود سے تجاوز کیا اور قانونی ضابطوں سے تغافل برتا۔ لیکن یہ وہ خامیاں ہیں کہ جن سے کوئی سیاست دان اور خاص طور پر جب وہ برسر اقتدار ہو مبرا قرار نہیں دیا جاسکتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اپنے حریفوں اور اپنے قاتلوں کے مقابلے میں ان کا مرتبہ، ان کا منصب اور ان کا کردار کیا ہے؟ یہ دیکھنے کے لیے بھٹو کی اس تاریخی دستاویز کا مطالعہ کرنا ضروری ہے کہ جو انہوں نے راولپنڈی جیل کی کالی کوٹھری میں ''اگر میں قتل کیا گیا'' کے عنوان سے مرتب کی ہے اور جسے خفیہ طریقے پر ہندوستان میں درآمد کرکے یہاں شائع کیا گیا ہے۔ موت کی وادیوں میں لکھی ہوئی یہ کتاب بھٹو کی بے پناہ ذہانت، عالمی سیاست پر اس کی گہری نظر، اس کی تحریر کی شوخی، اس کے استدلال کی خوبصورتی اور زبان و بیان پر اس کی بے پناہ قدرت کا زبردست ثبوت تو ہے ہی لیکن اس سے زیادہ یہ بھٹو کے قاتلوں کے خلاف ایک ایسی فرد جرم ہے کہ اسے پڑھ کر وہ اپنی تمام تر کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود اپنے حریفوں کے مقابلے میں ایک ایسی

عظیم شخصیت کے طور پر ابھرتا ہے کہ پڑھنے والا اس کی کمزوریوں سے بھی عشق کرنے لگتا ہے۔ بھٹو لکھتے ہیں کہ ''مجھ پر انتخابات میں دھاندلیوں کا الزام ہے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ الزام غلط اور بے بنیاد ہے میں پوچھتا ہوں کہ انتخابات میں دھاندلیوں کا الزام زیادہ بڑا جرم ہے یا قرآن پاک کی تلاوت کے بعد قوم سے نوے دن کے اندر اندر انتخابات کرانے کا وعدہ کرنے کے بعد انتخابات کو غیر معین عرصے تک اٹھائے رکھنا زیادہ بڑا جرم ہے۔ اسی طرح اپنے خلاف عاید ہر الزام کے جواب میں بھٹو نے اپنے قاتلوں کی ریاکاری، ان کی بے ایمانی عہد شکنی اور دغابازی کو اس طرح بے نقاب کردیا ہے کہ فوجی وردیوں اور تمغوں یں چھپے ہوئے بڑے بڑے جنرل الف ننگے نظر آتے ہیں۔ یہ بھٹو کے قلم اور اس کے بیان کا ہی اعجاز نہیں، اس کی معصومیت، اس کے خلوص، اس کی صداقت اور اس کی جرات کا بھی ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔

بھٹو جواہر لال نہرو کے بعد برصغیر کے دوسرے رہنما ہیں کہ جن کی کتابوں، تحریروں اور تقریروں سے ایک مربوط سیاسی فکر اور ٹھوس سیاسی نظریات ابھرتے ہیں۔ جواہر لال نہرو کی ہی طرح وہ ایک ایسے جدید ذہن کے مالک تھے کہ جس میں تعصبات، توہمات اور خرافات کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

"پاکستان میں پانچ ہفتے گذارنے کے بعد جب میں اپنے گھر کو لوٹ رہا تھا تو حسینی والا سرحد پر میرے بہت سے عزیز واقارب مجھے الوداع کہنے کے لیے آئے تھے، جوں جوں جدائی کا وقت قریب آرہا تھا ان کی آنکھیں نمناک ہوتی جارہی تھیں اور پھر جب ساری کاغذی کاروائیاں مکمل ہو گئیں اور میرے لیے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھنے کا لمحہ آ گیا تو چچا رحیم اور اُن کی بیگم مجھ سے گلے مل کر کچھ اس طرح روئے کہ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ ہم لوگ کچھ اس طرح جُدا ہو رہے تھے، کہ جیسے پھر کبھی ملنے کا امکان ہی نہ ہو، حسینی والا کی سرحد پر ہر روز سینکڑوں ہی ایسے رقت انگیز مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ برسوں کے بچھڑے ہوئے بھائی بہن، باپ بیٹا، ماں بیٹی، بیوی اور شوہر جب ملتے ہیں تو آنسوؤں کی خیرات دے کر اپنی خوش قسمتی کی نظر اتارتے ہیں اور جب ایک دوسرے سے جُدا ہوتے ہیں تو آنسوؤں کی برکھا سے حسینی والا کی سنگلاخ زمین کو تر کر دیتے ہیں۔ گذشتہ بیس بائیس برسوں میں اس جگہ اتنے آنسو بہے ہوں گے کہ ان کے جمع کر کے نہ معلوم کتنی بنجر زمین سیراب ہو سکتی تھی۔"

”پاکستان میں پانچ ہفتے گذارنے کے بعد جب میں اپنے گھر کو لوٹ رہا تھا تو حسینی والا سرحد پر میرے بہت سے عزیز واقارب مجھے الوداع کہنے کے لیے آئے تھے، جوں جوں جدائی کا وقت قریب آ رہا تھا ان کی آنکھیں نمناک ہوتی جا رہی تھیں اور پھر جب ساری کاغذی کاروائیاں مکمل ہو گئیں اور میرے لیے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھنے کا لمحہ آ گیا تو چچا رحیم اور اُن کی بیگم مجھ سے گلے مل کر کچھ اس طرح روئے کہ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ ہم لوگ کچھ اس طرح جُدا ہو رہے تھے، کہ جیسے پھر کبھی ملنے کا امکان ہی نہ ہو، حسینی والا کی سرحد پر ہر روز سینکڑوں ہی ایسے رقت انگیز مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ برسوں کے بچھڑے ہوئے بھائی بہن، باپ بیٹا، ماں بیٹی، بیوی اور شوہر جب ملتے ہیں تو آنسوؤں کی خیرات دے کر اپنی خوش قسمتی کی نظر اتارتے ہیں اور جب ایک دوسرے سے جُدا ہوتے ہیں تو آنسوؤں کی برکھا سے حسینی والا کی سنگلاخ زمین کو تر کر دیتے ہیں۔ گذشتہ بیس بائیس برسوں میں اس جگہ اتنے آنسو بہے ہوں گے کہ ان کے جمع کر کے نہ معلوم کتنی بنجر زمین سیراب ہو سکتی تھی۔“